

(افسانے)

پھوٹے

انتظار حسین

قدا مت پسند لڑکی

کچھوے

(افسانے)

وہ جست فہیں پہنٹی تھی اور اپنے آپ کو قدا مت پسند بتاتی تھی۔ کرکٹ کھیلتے کھیلتے اذان کی آواز کان میں بجتی جاتی تو دوڑتے دوڑتے رک جاتی سر پہ آبل ڈال لیتی اور اس وقت تک پاؤں تک نہیں کرتی جب تک اذان ختم نہ ہو جاتی۔

یہ اس لڑکی کا ذکر ہے جو مہاتا بدھ کی بیوہ تھی اور تیسوں روز سے رکھی تھی۔ کچھ کا پر دم گرم ہوا کرکٹ کا بچہ روزوں کا بھی تھا نہیں ہوا۔ گولے کی آواز پر وہ پرس سے لاپٹی لالچی روزہ افطار کرتی اور پھر صرف ہو جاتی اور انٹر کا بجیت تحریری مقابلے میں ایک مرتبہ وہ صرف اس وجہ سے ہار گئی تھی کہ جب اس کی باری آئی تو مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا اور وہ نماز قضا نہیں کر سکتی تھی۔

مگر وہ فرق پرست نہیں تھی۔ وہ مہاتا بدھ کی بیوہ تھی اور انسان دوستی اس کا مسلک تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے محسن کو جو سخیڑ اپنے ہاتھ سے بن کر دیا تھا اس کا مطلب محسن نے انسان دوستی کے سوا کچھ جانا۔ یہ سخیڑ مکان کر اس نے جذبے کی گرمی محسوس کی اور ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ مگر اسے نورانی پیچھے ہٹنا پڑا۔ محسن نے معذرت کی اور سادہ دہنا نے جواب دیا۔

”میں مہاتا بدھ کی بیوہ ہوں اور معاف کر دیا کرتی ہوں۔“

اس جواب سے محسن کو بہت احماس ہوئی۔ وہ خود بھی تو کوار سے اسلام پچایا نے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے اس واقعہ کی نقل اپنے ہاتھ سے کی خاموش تخلیق کا تصور کیا اور مطمئن ہو گیا۔ جذبے کی خاموشی پر اس تخلیق سے اس نے چند دنوں میں زمین کو ہوا پر پالیا اور تجویز پیش کی ”چلو کچھ دیکھیں۔“

اس نے اسے غور سے دیکھا اور تجویز کی سے بولی۔ ”دیکھئے میں بہت قدا مت پسند ہوں۔“

محسن کو ایک دفعہ پھر معذرت کرنا پڑی اور چونکہ وہ مہاتا بدھ کی بیوہ تھی اس نے اسے معاف کر دیا۔

چند دنوں میں اس نے کھوایا ہوا احماد پھر پالیا اور ایک روز جب وہ طے تو موسم بہت غولگوار تھا۔ اس نے موسم کو اٹھا رو نہیں جانا اور تجویز پیش کی کہ ”دہ پالیا نہیں۔“

وہ پھر تجویز دہائی اور بولی۔ ”دیکھئے میں بہت قدا مت پسند ہوں اور مردوں کے ساتھ ہونگ نہیں کیا کرتی۔“

انتظار حسین

ذوالہجاء کو کھڑا کر پڑھا یا اور بڑی عقیدت کے ساتھ اگر بتایا سلگائیں۔ یہ حسن نے اپنی انگریزی محفلوں کی کیماری سے پہلے لاکر پارک گھر صا اور غم گھنٹن کی پیشکش پر ڈال دیا۔ پھر صادق زین العابدین کا بازو دین کر سوز پر حا۔ یہ حسن سوز پر حا کر دئے اور بولے کہ "ذوالہجاء اور عظم سلب سے بڑے سبیل ہیں۔" پائیں ہمارے جیٹران سے کیوں متاثر نہیں ہوئے؟" اشرف نے کہہ پھیلے ایک سال سے مستقل مسلمانوں کا ساتھ کھاتا تھا۔ یہ متاثر متاثر ہوا اور قہقہے اٹا کر ہانپ گیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ اگلے برس وہ بھی کالی قہقہے پہنے گا مگر چونکہ چندی ماہ بعد مارکیٹ میں ایک نئی کتاب آگئی اور اشرف کو بچک سے چند اور چھانکات ہو گئے اس لئے یہ ارادہ ہی نہ رہا۔ وہ سکا۔ مگر حسن کے طریقے میں ایک اصلاح تھا۔ خدا کے وجود سے انکار تو اس نے بیٹھک میں فرست ڈروا جن لینے ہی کر دیا تھا اور اب تو خیر و بد احوال اسے ساتھ کرنا اسلام کا وہ ایک شوشل موومنٹ کے طور پر پیش کا جا رہا۔ ساتھی اصلاحات کے اس پر وہ کرم کو ساتھ دھنوں سے بچانے کے لئے امام حسین نے جو قربانی دی اسے وہ چاہتا تھا۔ البتہ عزم میں وہ در نظام کا طالب تھا تاہم یہ حسن کے گھری مجلس میں بیٹھنے اور دل لینے میں اسے مضائقہ نظر نہیں آیا۔

سادہ نیاز کو حسن کے کرپہ کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس نے بے تعلقی کے انداز میں کہا۔ "کوئی رافضی ہو یا مرزائی اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو ہمارا تباہی ہی ہوں۔" یہ عجیبہ جسم کی بے تعلقی اس کا مخصوص وصف تھی اور نازک سے نازک موٹے پر برقرار رافضی تھی۔ جب اس نے لایڈی مائلٹر لیڈ لوز کا سالم ایڈیشن فتح کیا اور کرداروں کے رویے پر حسن سے تامل خیال شروع کیا تو حسن کو ایک مرتبہ پھر زمین ہموار نظر آئی اور اس نے بحث کی گراہی میں اس کا ہاتھ قلم لایا۔ سادہ نیاز بولے بولے کی مکمل بے تعلقی سے اپنے ہاتھ کو حسن کے ہاتھوں میں دیکھا اور عجیبہ کی سے بولی۔ "آپ کو یہ معلوم ہے کہ میں ایک قدامت پسند لڑکی ہوں۔" اس فقرے پر حسن کے ہاتھوں کی گرفت آپ ہی آپ ڈھیل پڑ گئی اور سادہ نیاز نے نہایت محتانت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

سادہ نیاز حسن کی کوٹھیں اپنی بہن ذراہ کو بھی غیر عجیبہ و جاتی تھی اور ذراہ واقعی غیر عجیبہ و جاتی تھی۔ اس کے کمرے میں بغیر دھک دے پھس آتی اور اگر وہ سوئی ہوئی تو لٹاف اٹھا کر الگ بیچک دیتی۔ اسی بڑا گنگے پن میں تو وہ اعلیٰ تعلیم سے عزم و ہمتی تھی۔ مگر کے کرداروں سے لے کر مقصد کے بائیس بیچک تھا لیکن لکائی بھرتی تھی۔ جب انگریزوں کی چھاپیں خالد کے گھر گزرنے آیا تو سادہ نیاز نے تو اسے مطلق منہ نہیں لگایا۔ منہ لگائی فرسٹ اینڈ کا تو وہ طالب علم تھا مگر ذراہ و ایک دن کے اندر اندر اس سے مکمل مل گئی۔ غیر پہلا دن تو کبھی اسماں توڑنے ہی میں گزرا کیا اور دونوں اس میں ایسے فرق ہوئے کہ انہیں ایک دوسرے کے وجود کا احساس تک نہیں ہوا۔ دوسرے دن جب انہیں ایک دوسرے کے وجود کا احساس ہوا تو وہ بھی جب طرح سے۔ نہ انہوں نے وہ دھانک بائیں کی جھین نہ ایک

دوسرے کا ہاتھ تھا نہ اٹھانے کا بلکہ بلکہ بھکاری تھی۔ ہوا میں کہ جب وہ اسماں توڑ کر درخت سے ذراہ کا سہارا لے کر اتر رہا تھا تو اس کا سانس تیز اور گرم ہو گیا۔ اور گرمی اس وقت بہت تھی۔ اس جتنی وہ پہری میں درختوں کے درمیان گھومتے گھومتے ان کے جسم پھٹنے لگے تھے۔ ذراہ کے گورے کال گرم ہو کر سرخ ہو گئے تھے اور قہقہے پھینکے کر بیٹیاں والی بھری پشت پر پھینکے جتنی تھی اور اس کے شانوں کے سہارے درخت سے چپے اترتے اترے افوا کا سانس تیز ہو گیا اور انہیں اس پھٹکی کر کے گرد لپکتی چلی گئیں اور جیسے گرم وہ پہرہوں میں دان چھپتے چھپتے انکا کبھی سر نہا پھوٹنے لگتا ہے اور مرئی پھیلنے لگتی ہے اور پھر دونوں غصہ تھا ہو جاتے ہیں اس اسی طرح کھڑی وہ پہرہ میں ایک اندھیرے نے انہیں آٹھانے لایا۔

جب اندھیرا چھٹ گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا اور بہت پاکیزہ محسوس کیا۔ بس انہیں یوں لگا کہ کبھی اسماں کھاتے کھاتے انہوں نے کوئی ٹھکانا بس ہوا آسم چس لیا ہے۔

مگر سادہ نیاز کو آسم اور اسماں سے نفور تھا۔ نظر بیکر بنائیں گے ہوئے سردے کو نکال کر کھینچی کی سفید پینٹ میں وہ بڑے سلیطے سے اس کی دو چھائیں تراشچی چھانکوں کو فٹہ لڈ کرتی اور ایک محتانت آمیز بے تعلقی کے ساتھ انہیں کانٹے سے تامل کرتی۔ مذہبی عقیدے سے لے کر سردے کی قاش تک اس نے یہ محتانت آمیز بے تعلقی برقرار رکھی تھی۔ مگر حسن اور اس کے درمیان پھر بھی لڑائی ہو کر رہی۔ ہوا میں کہ انکس پر پیلے کا مسئلہ درمیان میں آ گیا۔ حسن اسے دیکھ کر کہا تھا بات بڑھ گئی اور سادہ نیاز نے اعلان کیا کہ "میرے اور آپ کے درمیان نظریاتی اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔"

حسن نے جب یہ نظریات کا اطلاع اشرف کو دی تو اس نے اسے بھڑک دیا۔ "مفسول باتیں مت کرو۔ عورت اور مرد کے درمیان نظریات کا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوتا۔"

"مگر وہ ہوا کہ ہے۔"

"ہوا کیا ہے تو یا قلم مر نہیں ہو یا وہ عورت نہیں ہے۔"

اشرف کا نظریہ یہ تھا کہ نظریات آدمی کی حماقت ہیں۔ عورت کے نظریات نہیں ہوتے احساسات ہوتے ہیں۔ مگر سادہ نیاز کو یہ احساس تھا کہ وہ نظریات رکھتی ہے۔ اس کے اسی احساس نے حسن کے لئے جدائی کی اذیت کا سامان کیا۔ عروہی کے عالم میں حسن نے کیا کچھ نہیں سوچا۔۔۔۔۔ کہ وہ خود کو کئی لے کر وہ کپڑے پھاڑ کر جنگل میں اکل جائے اور ساہوین جائے۔

یہ حسن نے ان میں سے کسی تجویز پر صاف نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب اٹھارہ اذیت کے رد واتی سامنے ہیں۔ "اور عشق"

فون آتا جو ایک حسن فون پر باتیں کرتا اور دوسرا حسن کو نے میں کھڑا ہو کر فون پر باتیں کرنے والے حسن کو کٹار دیتا۔ مگر بعد دوسرا حسن خود ہی رفتہ رفتہ اچھا پڑ گیا۔

پھر ایک روز حسن نے کسی قدر 20 کے ساتھ مقصود سے کہا کہ یا اس لڑکی کا معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔

ابھی مقصود نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

ہاں یا۔ حسن نے پریشان ہو کر کہا۔ خطا بہت لگتی ہے۔

"اور تم؟"

"میں بھی لکھتا ہوں۔"

"توجہ دے دو گی؟"

محبت کے لفظ پر حسن بہت ہلکا۔ اور اس کے بعد اس نے اچھے خاصے دلوں تک اس مسئلہ پر مقصود سے کوئی بات نہیں کی۔ مگر پھر عزیز سے باتیں کرتے کرتے یہ لفظ خود ہی اس کے منہ پر آ گیا۔ "یار مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی۔"

"محبت؟" عزیز نے افسوس سے کہا۔ "وہ کیا ہوتی ہے؟"

"پتہ نہیں یا؟" حسن تھوڑا شینا گیا۔ "مگر وہ خطا بہت لگتی ہے اور میں بھی خطا بہت لکھتا ہوں۔"

"تو یہی بات کہو کہ ایک ایک شخص رسی ہے مگر وہ پتہ وہ خطا کبھی ہے۔"

حسن نے وضاحتی جملہ مندرجہ ذیل انداز میں کہا۔ "نہیں یا! یہاں معاملہ نہیں۔ ہماری خطا کتابت انگلیچہ کل پر ہوتی ہے۔"

انگلچہ کل سناں پر؟ عزیز پھر ہلکا گیا۔ انگلیچہ کل سناں پر خطا کتابت اور لڑکی سے؟

حسن نے پھر مندرجہ ذیل انداز میں کہا۔ "نہیں نہیں۔"

کسی نہیں۔ عزیز نے حیرت سے کہا۔

اور حسن نے دے سے لہجہ میں کہا۔ وہ بہت تنبیہ دلائی ہے یا۔

عزیز نے اپنے قصہ پر قابو پا دیا اور پھر کہا کہ۔ دیکھو حسن ہر لڑکی تنبیہ ہوتی ہے۔ مگر کوئی لڑکی تنبیہ نہیں دیتا چاہتی اور ہر لڑکی جو کالٹی میں پڑتی ہے۔ انگلیچہ کل خطا لکھے گی۔ مگر کوئی لڑکی یہ نہیں پسند کرے گی کہ اس کے انگلیچہ کل خطا کا جواب انگلیچہ کل سے دیا جائے۔

حسن نے یہ بات کسی قدر شک کے ساتھ قبول کی۔ مقصود نے جب یہ سنا تو افسوس بھرے لہجہ میں کہا کہ "فرمانی یہ ہے کہ بے چارے عزیز کی تعلیم الاحقری رو گئی۔ اس کی ایک خاص ذاتی سطح ہے اس سے بلند ہو کر وہ نہیں سوچ سکتا۔" "چپ ہوا۔" پھر بولا "جن لڑکیوں سے پلاؤ وہ وہی انکی دیکھی نہیں۔ کسی شریف تعلیم یافتہ لڑکی سے اس کا ربط ہوا ہی نہیں۔ انکی لڑکی ہمیشہ یہ سمجھتی ہے کہ کیا آپ اس سے ذاتی طور پر برتر ہیں۔ ذاتی لحاظ سے اپنے سے کمزور کو قبول نہیں کر سکتی۔"

اصل میں عورت کے بارے میں مقصود کے اپنے نظریات تھے اور عزیز کی اپنی ایک مخصوص بصیرت تھی۔ حسن دو بصیرتوں کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ مگر موت اور عورت ان دو کے سامنے آدلی آکیلا ہوتا ہے۔ اپنی ہی بصیرت ہو کر کام آتی ہے۔ حسن بصیرت سے محروم تھا۔ اس نے فراہمی سے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا۔ پھر کچھ دوسرے مقصود سے لیا اور کچھ انکو اپنے اوپ عزیز کے سامنے کہہ دیا۔ اور عزیز یہ کہتا تھا کہ محبت مستحسن ہے۔ جو عورت تمہارے پاس آتی ہے وہ ایک سوال بن کر آتی ہے اگر تم نے اس کے سوال کو سمجھا لیا تو تم نے اسے توڑ دیا نہیں سمجھا تو وہ جیسے توڑ دے گی۔ مقصود عزیز کی انکی سب باتوں کو سن کر ایک بات کہتا تھا کہ پرانے لوگوں نے عورت اور مرد کے رشتہ کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کے حریف اور مقابل نہیں ہیں اور محبت کوئی جنگ نہیں ہے۔

حسن ایک وقت مقصود اور عزیز دونوں کا قائل تھا تو کبھی وہ زبیدہ سے یوں رجوع کرتا جیسے وہ سپاہی ہے اور اسے اس قدم کو فتح کرتا ہے اور یہ ہم کرتی ہے اور کبھی یوں رجوع کرتا جیسے وہ محنت ہے اور مندر میں داخل ہوا ہے۔

زبیدہ کی روائی یکساں تھی۔ اس نے شرعی میں گتہ دیا تھا کہ میں اپنی عہدگی کے جہنم میں اپنے آپ کو محفوظ کرتی ہوں مگر اس معذرت نے اسے اقرار فرمایا۔ یہ معذرت حسن کے دانشورانہ حراف میں کب گئی۔ اس فقرے سے اس پر وہی اثر کیا اور خوشنودان پڑھ لڑکیوں پر بھی مکالمہ اڑا کرتا ہے۔ اس نے اس خطا کا جواب بہت سوچ سمجھا کر دیا اور لکھا کہ میری ذات میرا جہنم ہے۔ میں اس سے نجات چاہتا ہوں۔

اس دانشورانہ روانی لہجہ میں بہت سے خطا حسن نے لکھے اور بہت سے جواب زبیدہ نے دیے۔ مگر پھر حسن ٹھک گیا اور اس نے سوچا کہ میں نے محبت کو ایک طبعی مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک سیدھا سادہ انسانی تجربہ ہے۔ اس احساس کے تحت اس نے اپنے صبا رفاہی غم کو توڑی لگام دی۔ خبر کا کام تو اس نے دے لی مگر یہ کچھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ اسی الجھن میں اس نے ایک روز مقصود سے کہا۔ "یار میں تھوڑا سا پتہ وقف نہیں ہوں۔"

دوسرے دن کوٹھی کا چلا ہوا نظریہ دو در سے پڑھاں رہا تھا کہ سٹیدی ہوئی ہے چھانک کے باہر قلعے کے لٹا ہوا بھرے داخل بھی رکھے تھے کہ چھوے راج کام کرتے کرتے انہیں چھوڑ گئے ہیں اور آج کے لٹا ہوا کام سے لگ جائیں گے۔ میرے قدم ہمارا تھوڑا تھوڑا اٹھنے لگے۔ کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی میری نگاہوں نے اسی باہر والی دیوار کو ٹھوٹا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ساری دیوار پر سٹیدی پٹی ہوئی تھی اور سٹیدی پٹنوں شوشوں اور غروں سے پورا ہوا وہ چلا سٹیدی میں ڈوب چکا تھا۔ اچانک کسی نے میرا راستہ کاٹ دیا اور ایک ان دیکھی دی مجھے پکڑے لے دی تھی۔

ہاتھ میں دیکھی کی پٹی ابھری کہ روش پودہ یہ جھاڑیوں کی جڑی ہری گھنی شاخوں اور پھٹکوں کو تیزی سے کاٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو واقعی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اب بھی اب وہ مانی ہی لگتا تھا۔ کوئی پر اسرار حقوق نظر نہیں آتا تھا کہ مجھے جھک ہوئی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سادگی سے رکھا اور اسی سادگی سے چل چلا۔ "انجیور صاحب کے تو آج بہت مہمان آئے معلوم ہوتے ہیں؟"

"مہمان تو کوئی نہیں۔" مانی کی پٹنی اسی طرح چلتی رہی۔ "نئے انجیور صاحب کے گھر والے ہیں۔"

"نئے انجیور صاحب؟" میں چمکا اور دھڑکا راتھی پٹی۔ سختی واقعی بدلی ہوئی تھی۔

مانی اسی طرح ہاتھ دوڑے علیہ سادگی سے بولا۔ "ہاں جی اب نئے انجیور صاحب آ گئے ہیں۔ پہلے انجیور صاحب تو گئے۔"

"کہاں؟"

"انہوں نے وطن لے لی۔"

"وطن؟ اچھا؟" مجھے یہ بات نہ جانے کیوں اتنی جب معلوم ہو رہی تھی چند لمحے خاموشی رہی۔ بس ہری شاخوں میں پٹنی کے دروازے کے دروازے کی آواز آتی رہی۔

پھر مانی آپ سی بولا اور اس مرحلے کی آواز میں غصوں کی بھی ایک کیفیت تھی۔ "اُمی اچھا ہی ہوا کہ ان کی فیشن ہوئی جب سے ان کا بیٹا مراد تھا ان کا داغ بال بے پناہ ہو گیا تھا۔"

"بیٹا؟ اچھا بیٹا مراد تھا انجیور صاحب کا؟" ایک ایک لمحہ ہوئی اور کاسرا ملتا دکھائی دیا۔

"نہیں جی وہ بیٹا نہیں تھا۔" مانی نے پٹنی زمین پر ڈالی کہ سیدھی کی میری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ "انجیور صاحب بچا رہے تو اکیسے تھے وہ ان کے پانک تھا بہت لاڈ کرتے تھے اس کا بس دوسرے تھے انجیور صاحب اور لے پانک۔ اور کیا دیکھنا رہ گیا تھا انہیں بس اسے دیکھ کر بیچتے تھے نہ کسی سے ملنا نہ کسی کے پاس جانا نہ کوئی ملتا تھا۔ دھڑا دور وہاں سے سیدھے گھر نہ

کوئی قصہ کھیرا اسی کے ساتھ مکن رہتے تھے۔۔۔۔۔ اسے لوں لگ گئی۔ لگی کی طرح میں مر جھا گیا۔۔۔۔۔" مانی کسی سوچی میں ڈوب گیا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "انجیور صاحب پھر اکیلے رو گئے بہت دنگی رہتے تھے بچا رہے ہاتھ کھڑے کھڑے رہنے لگے تھے۔ نوکری سے بھی بچی اچٹ گیا تھا۔ اب دور سے پہنچے ایسے ویسے ہی جاتے تھے بس اس کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز کا گیند کو بٹے کو سنبھال کے دیکھ چھوڑا تھا۔۔۔۔۔ اچھا ہی ہوا پٹن لے لی۔ ہاتھ چل بے چال ہو گئے تھے۔" اس نے آہستہ سے جھپک کر پٹنی اٹھائی اور میری طرف دیکھے پھر دوسری روش کی طرف ہولیا۔ کچلے میدان میں کہیں کہیں بہت دور کا دکا خواب میں چلتی اور چلتی ہوئی بھینس پھر وہ دور یہ آسموں کے بے فکر درخت کو خم ہونے میں نہ آتے تھے۔ مٹن سکول کی سرخ عمارت عمارت سے کہیں بہت آگے نکل کر کھڑکی کالی کالی چپ چاپ چنیاں جو قریب ہونے کی بجائے دور ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ اس روز وہ لمبی اونچی چنگی گرد آلود سڑک کہ کبھی سیدھی چلتی اور کبھی نیڑھی کھاتی دکھائی دیتی اتنی ایسی تھی کہ میں جیڑا ہو کر ریل کی پٹری کو چھوئے پھر وہاں سے ہولیا۔



پاول

وہ باروں کی تلاش میں دور تک گیا۔ گلی گلی گھومتا ہوا دیکھ کر کوئی پہنچا۔ وہاں سے کچھ پر پڑ گیا اور کھیت کھیت چلا گیا۔ مخالف سمت سے ایک گھوڑا لگساں کی تھنڑی سر پر رکھے چلا آ رہا تھا۔ اس نے روکا اور پچھا کہ ”اھر ہاڈل آئے تھے؟“

”ہاڈل؟“ گھوڑے نے اس قوب سے کہا جیسے اس سے بہت الوکھا سوال کیا گیا ہو۔

”ہاں ہاڈل“ اب جب گھوڑے کی حیرت میں کوئی کمی نہ آئی تو وہ اس سے پوچھ رہا تھا ”اھر آ گئے چل کر اس نے کھیت میں ایک مل چلائے ہوئے کسان سے سبکی سوال کیا ”اھر ہاڈل آئے تھے؟“

کسان کی سمجھ میں بھی یہ سوال نہ آیا۔ اس نے شہلا کر کہا ”ہاڈل؟“

”ہاں ہاڈل“

اصل میں وہ پارلوں کے حلقے ایسے پوچھ رہا تھا جیسے وضو نہ دے اور پلٹے ہوؤں سے کم ہو جانے والے بچے کے سحر پر چلتا ہے۔ شاید ہاں بھی گمشدہ بچے تھے کہ وہ انھیں وضو نہ پکڑ رہا تھا اور ہر بار پلٹے سے پوچھ رہا تھا مگر کسی نے اسے نکلی بخش جواب نہیں دیا۔

سب سے پہلے آج صبح اس نے ماں کی سے یہ سوال کیا تھا "ماں کی پہل کہاں گئی؟"

کون کہاں گئے؟“ اماں نے اس سے ایسے پوچھا جیسے اس نے بہت امتحانہ سوال کیا تھا۔

۵۴

”ہاں۔۔۔۔۔ ارے قیصر! دماغ چل گیا ہے۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھونا شستہ کر اور اسکول جا۔“

اماں کی کس کس اعزاز بیان نے اس پر ایک نغمہ انگوارا چڑھوڑا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ نہ دھویا نہ شستہ کیا اور کہیں کوا جگمگاتے میں ڈال کر سکول کے لیے گھر سے نکلا۔ مگر گھر سے نکلتے ہی اس کے ذہن میں بھاری سواہی ابھرا ڈال دی کہیں گئے؟ اور اس کے ساتھ اسے رات کا وہ وقت یاد آیا جب آپ اس نے ڈال اٹھنے نہ کرتے دیکھے تھے۔ جب وہ سونے لگا تھا اس وقت آسمان بادلوں سے

خالی آستاروں سے بھر اہوا تھا۔ ہوا بوند تھی اور گرمی سے خند نہیں آ رہی تھی۔ اسے مشکل سے خند آئی۔ بھر جانے کی وقت تھا کہ اس کی آنکھ مل گئی۔ جو وقت بھی وہاں کے لیے وہ آدھی رات تھی۔ دور آسمان پر بادل ایک گرنے کا ساتھ دے رہے تھے۔ آسمان میں پہلی پہنچی اور اس جہک میں وہ بادل بہت کالے کالے نظر آتے۔ اسے لگا کہ بہت زور کی بارش آئے گی۔ مگر اس میں خند کتنی مراب ہوئی۔ بس اسی اندیشے سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے ہو گیا۔ جیسے اسے خبری نہیں ہے کہ بادل گرنے وہے ہیں۔ سو گیا۔ صبح جب اٹھا تو حیران رہ گیا۔ آسمان..... آسمان بادلوں سے بالے خالی تھا اور جن میں ہوا بوندیں پڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اسے پہلے تعجب ہوا۔ پھر افسوس ہوا۔ جب اس پر کہ بادل اسے اسے ٹھنڈا آئے تھے اور برے نہیں۔ پھر گئے کہاں۔ افسوس اس پر کہ وہ سو سکیں گیا۔ جیسے وہ جاگتا تو بادل آنکھوں سے لہجہ مل نہ پوچھتے اور پھر برس کر ہی جاتے۔ وہ بارش ہو جاتی تو موسم کی پہلی بارش ہوتی۔ مگر اس کے سامنے بادل گھر کر آئے اور چلے گئے۔ بارش کی کوئی بوند نہیں پڑی۔ برسات کا موسم خالی گزرا جا رہا تھا اس نے چلے چلے ایک بار پھر آسمان کا ہاتھ دلیا۔ دو رنگ کوئی بادل نہیں تھا۔ خالی آسمان میں صورتیں اس کے سر پر چمک رہی تھیں۔ وہ سول کا راستہ چھوڑ کر کھٹوں میں نکل گیا۔

کھتوں کے لٹائی ہوئی جگہوں پر ہوا ٹھنک گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی اس کا بدن جھٹکنے کا محض خشک ہو گیا۔ کئی محبت پار کرنے کے بعد گھسی جھاڑوں اور ایک بڑی دکھائی دیا کہ اس کی جھاڑوں میں توں مل رہا تھا۔ گویا ریکٹان میں چلنے پھرنے آگیا۔ اس نے دوست کی جھاڑوں میں چھٹی کر کہا کہ ایک طرف رکھا۔ کوئیں کے پاس چھٹی کر رہتے ہوئے پانی سے پھر دھوئے۔ ہاتھ دھو دھو اور پھر جی بھر کر پی جائے۔

مذہب کا دھوکہ پانی پی کر آنکھوں میں غصہ لگ اور روشنی آئی۔ اب اس نے اور مرگ کا جائزہ لیا۔ کونجیوں کے پاس جی ٹو نے سے سوئے تھے ایک بڑے میاں بیٹھے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ کچھ کہتا تھا مگر بھر صمت چھوڑ بیٹھا۔ آخر اس نے صمت کا دم بھی اوروں کا "بڑے میاں" اوجھ پال دیا "آئے تھے؟"

بڑے مہاں نے حق چیتے چیتے اسے غور سے دیکھا۔ پھر اسے "بیٹا ہاں! چپ کر آؤ نہیں آئیں گے۔ جب مگر کر آئیں گے تو آسمان زمین کو بھل جائے گا۔"

مگر رات کو ہا دل آئے تھے اور کسی کو بچہ ہی نہ چلا۔“

”رات پاول آئے تھے؟“ بڑے میاں نے کچھ سوچا۔ مگر اونچی آواز سے اللہ دین سے مخاطب ہوئے ”اللہ دین رات پاول

اللہ عین عیون کو ہاتھ پاتھ رکھا۔ ہوا "میں تو جی رات کھات پینہ لگاتے ہی سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں۔"

پھر بڑے میاں بولے "بیٹا! دادوں کے خالی آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ایسے علاقے میں رہ چکا ہوں جہاں دس سال سے بارش نہیں ہوتی تھی۔"

"دس سال سے؟" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں دس سال سے ٹھہر پال آتے تھے جسے جن دنوں وہاں تھا ان دنوں بھی ایک دفعہ پال بہت گھر کرتے تھے۔ مگر پانی کی ایک گندھ نہیں پڑی۔"

"جیسا بات ہے۔"

"جیسا بات کوئی نہیں۔ بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے اس کا حکم ہوتا ہے تو پال برستے ہیں اس کا حکم نہیں ہوتا تو پال نہیں برستے۔"

بڑے میاں کے اس بیان کے ساتھ اس کے قصور میں پچھلی حلقہ گتہ میں امنڈ آئیں وہ گتہ میں جو گتہ نوپ اندر جڑے کے ساتھ ابھیں جیسے برس کر جمل قفل کر دیں گی۔ مگر بوند برساتے بغیر گزر گئیں۔ وہ گتہ میں جو چند بے معنی سی بدلیوں کی صورت میں آئیں اور انکی برسیں کہیں کہاں امنڈ آئیں۔

بڑے میاں نے نیچے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر بڑے آئے "موسم گزرا جا رہا ہے پتہ نہیں اس کا حکم کب ہوگا؟"

جواب میں وہ بھی بڑا بڑا "میں برساتی نہیں۔ پتہ نہیں پال آ کے کہاں چلے گئے۔"

"بیٹا کہا برستے برستے گا تو خبریں آئے تھیں گی کہ سلاب آگیا۔ آسمان ٹپیل ہو گیا۔ زمین میں طرف نہیں رہا۔ بارش ہوتی ی نہیں۔ ہوتی ہے تو سلاب امنڈ پڑتا ہے۔"

بڑے میاں کی باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آئیں کچھ نہ آئیں۔ وہ بیٹھا سنا رہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ آسمان کا ایک اٹھانے لگے میں داخل اللہ کھڑا ہوا۔

مٹی دھول اور دھوپ میں وہ در تک چلا رہا۔ جن راستوں سے آیا تھا انہی راستوں پر لوٹ رہا تھا۔ دھوپ اب بھی تیز تھی۔ مگر جب وہ مٹی کو نیا کے پاس پہنچا تو اسے لگا کہ وہاں ایک لمبی لکیری تیر تھی ہے اور قدموں کے نیچے مٹی پکھیل سکی ہے۔

بستی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رست یہاں سے وہاں تک گیا ہے اور رست کہ اس کے جاتے وقت روز کی طرح دھول میں اسے کھڑے تھے اب نہائے دھوئے نظر آ رہے ہیں اور نالہ کہ پچھلی برسات کے بعد خشک چلا آ رہا تھا رواں ہو گیا ہے غرضی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی اب اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ دیکھتا چاہتا تھا کہ اس کے گمن میں جو جاسن کا چل کھڑا ہے وہ کتنا تر ہو رہا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے فضا کو بارش کے حساب سے بدلا ہوا پایا۔ جاسن سے بہت سے بچے چھپ کر رہے پڑے تھے اور ٹیلی مٹی میں لت پت تھے۔ باقی درخت نہایا دھوپ کا کھڑا تھا اور اس جی ایک آسودگی کے لمحے میں کہہ رہی تھیں "ابھی بارش ہو گئی۔ اللہ حیرا کھر ہے۔ میرا تو گری سے دھاتے لگا تھا۔"

جاسن کی ٹہنیوں سے بوندیں ابھی تک ٹپ ٹپ کر رہی تھیں۔ وہ بچے کے چھپ کھڑا ہو گیا اور بوندوں کو اپنے سر پر اور اپنے کانوں پر لیا۔ اس کی نظر آسمان پر گئی۔ آسمان دھلا دھلا نظر آ رہا تھا۔ اب وہاں کوئی بدلی نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ بادلوں کی تلاش میں دھوپ اور دھول میں سختی دور تک گیا اور پال اس کے پیچھے آئے اور برس کر چلے بھی گئے۔ اس خیال نے اسے اداس کر دیا۔ بارش میں ٹپکی ساری گھٹا اسے بے معنی نظر آنے لگی۔



”اچھا؟“

”ہاں“

”کیا ہوا؟“

”بڑا ٹینا تار بندی پلے پلوس مار دھاڑا طلبا کے بنگے نے گر کر تار پلاس۔۔۔“

جاوید نے سامنے میز پر پڑا ہوا قصہ دیکھ کر ہنس دیا اور اس کا ہنسنے پھٹنے لگا۔ یہ رسالہ دو صبح سے میز پر پڑا کچھ ہاتھ گھراس کو یا تو اسے دیکھنے کی فرصت نہیں ملی یا دیکھنے کو بھی نہیں چاہا۔ اس وقت اس رسالے نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کی تصویریں اسے بہت اچھی لگی تھیں۔

”ایسا عجیبی سی تو اچھی خاصی خاندانی شری شروع ہو گئی۔ سو رہے تین گئے اور تین تھیں آجیں چار ہی رات کو ملی چلی۔“

”چھاپا ہے۔“ جاوید مسکرایا۔

”کیا؟“

”کیا ٹوٹا۔“ جاوید نے رسالہ انور کی طرف بڑھا دیا۔

انور نے کارٹون دیکھا۔ کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا۔ بے دلی سے کہا ”ہاں اچھا ہے۔“ اور چپ ہو گیا۔

”یار ہارڈ ٹیمیں۔“ جاوید نے تجویز پیش کی۔

”ہاں چلیں۔“

”ہاں یار گھر میں بیٹھے تو یہی ایک سلسلہ چلتا رہے گا۔ آنے والوں کا تانہ بندھا رہتا ہے۔ وہی سوال وہی باتیں۔ یہی اسیری ہے۔ چلو چلیں۔“ وہ تڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر کے دروازے کے قریب جا کر اونچی آواز سے کہا۔ ”میں ذرا انور کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

انور انور کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

”یار تمہیں سندھ کے فسادات کی خبریں ملی ہیں؟“ انور کو بچا یک خیال آیا کہ یہ ساتھ بہت ٹھیک اور التاک تھا۔ جاوید کو اس سے

باخبر کرنا چاہیے۔

”رینے کی خبروں سے کیا پتہ چلتا۔ بہت التاک واقعات ہوئے۔ بہت لوگ مارے گئے بہت سے گھر بے گھر ہو گئے۔ تم

نے کیا بات کر دیتا تو دیکھا تھا۔ کتنا بڑا ہمارا تھا۔ چار ہزار مل کر رکھ ہو گیا اور کوئی آدمی نہیں بچا۔۔۔۔۔“

”اچھا تم یہاں کی سٹاؤ۔“

”یہاں کی؟۔۔۔۔۔ یہاں کی کیا سٹاؤ؟“

اصل میں انور کے لیے یہ سوال غیر حتمی تھا۔ شعوری طور پر نہ کسی غیر شعوری طور پر اس نے یہ بے کر کہا تھا کہ جو کچھ ہوتا تھا وہیں ہوتا تھا۔ سو رہ کر یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں کے متعلق پچھتے جا رہا تھا یہاں کے متعلق سوال ہوا تو جیسے وہ بے خبری میں پکڑا گیا۔

”یہاں کیا ہوا؟“ جاوید نے پھر اپنے سوال پر اصرار کیا۔

”یہاں کیا ہوا!“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔۔ پھر بولا ”یار یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔“

کئی بات بنے کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو تم نے وہاں دیکھا اس کے سناٹے میں یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔

”اچھا!۔۔۔۔۔ وہاں اہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں بھی بہت کچھ ہو رہا ہوگا۔“

انور رسالت کے کچے میں بولا ”ہاں یار یہاں کچھ نہیں ہوا۔“

”جنگ تو بہر حال یہاں بھی ہوئی تھی؟“

”ہاں جنگ تو ہوئی تھی۔“ انور نے کچے سے کچے میں کہا۔

گھنگھو یہاں آ کر غور و فکر کرنی۔ انور پوچھنے میں جو گرم جوش دکھا رہا تھا وہ اب ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ جاوید نے بس بونٹی پر چھایا تھا۔ زیادہ اطمینان اور جس کا مظاہرہ اس نے نہیں کیا۔

انور پھر خود ہی بولا ”اصل میں یہاں سے باہر سے کچھ نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا“ اندر سے ہوا۔“

”باہر سے کچھ کچھ نہیں ہوتا“ جاوید نے سادگی سے کہا ”جو کچھ ہوتا ہے اندر سے ہوتا ہے۔“

”ایسی بات تو نہیں ہے؟“ انور نے کسی قدر گرمی کے ساتھ کہا ”وہاں تو زیادہ تر باہری سے ہوا۔ البتہ یہاں اندر سے زیادہ ہوا۔“

اس لیے جنگ کے بعد زیادہ ہوا۔“

”یار پی پیٹ پاور ایلوں پے خانے سے کیسے بنے ہوئے ہیں؟“ جاوید فصیح کرکھڑا ہوا۔

انور ہوتے ہوتے چالیس رک گیا اور اسی طرف دیکھنے لگا جس طرف جاوید و کچھ رہا تھا۔ یہ سینما ہال کے باہر آوید اس پر سڑقاٹھس پر خم رہہ نہ صورت کی لائی تصویر بری تھی۔ اس کی بھری بھری رانوں پر اور ناف تک ایک بوسے چپٹ پر چار تھا۔ ہاتھ ہاتھ تھا۔ یہ تصویر شے فوراً مٹ جاتے اور دیکر کہہ دیتا تھا اس وقت اسے بہت بری لگی تھی۔ کھڑو پاؤں اور دونوں کے چل چل رہے۔

”آئیں کریم کھاؤ گے؟“ انور دوکان کے سامنے پہنچ کر پکا یک رنگ گیا۔

”کھا لیں گے۔“

آئیں کریم کھاتے کھاتے جاوے گی انھوں نے اس لڑکی کا تعاقب کیا۔ جو پھر پہنے بڑے بڑے گول شیشوں کی عینک لگائے نمودار ہوئی تھی۔ اور اس وقت تک تعاقب جاری رکھا جب تک وہ اندر داخل نہیں ہوئی۔

”پیارا نور! ادھر میرے پیچھے تل ہاتھ تو قابض ہی ہو گیا۔“

”اور جست و خیزوں بھی۔“

"جست جہان بھی اور جست فطیس بھی۔۔۔۔۔ بادالوراحمرنے بتایا میں کہ یہاں کہا ہوا۔"

”خیر ہوا تو دیکھی رہے ہو۔“ انور نے آئیں کریم کھاتے ہوئے طرے لہجے میں کہا ”نفل باہم رخصت ہو گیا مگر آگیا۔“

”نہیں بہت بڑا واقعہ ہے۔“ انور کا لہجہ اور

”میں یاد رکھی للچر سے اپنے آپ کو مانوس نہیں کر پاتا ہوں۔“ آئس کریم قلم کرنے کے بعد اس نے خیال نوکری میں پھینکا۔
”بس چلیں؟“

۱۲ "طیلس"

உயிர்

النوراني

"...and I will be glad to see you."

”وَمِنْهُمْ مَنْ قَالَ مُطْمَئِنِّمْ عَلَيْهِمْ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِمَا يُشَاءُ“

”میرا مطلب ہے کہ اس لمبی اسیری کے بعد جب تم یہاں آئے تو تم نے کیا محسوس کیا؟“

دارکمال ہے۔ ”ہاؤس طے طے پر فصح کیا۔

“Tutut”

”باراس نوجوان کو دیکھو اس نے مگلائی شلوار پہن رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ریٹھی ہے؟“

"YUSA"

”کچھ نہیں ہوا؟“ چاہیے چپ ہو گیا۔ پھر بولا ”کیا رستم اور دنگ نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں؟ میں نے اور بھی فوٹو کوال پلے ٹیج کر کے فلوئورس بنو دیا ہے۔“

”ہاں اس کا اچھا خاصہ علاج ہے اور اس کو کڑا ہی گوشت کھاؤ گے“

“کشمکش و کشمکش”

۱۱. اُنار اُکھا زکاتہ۔ صر اُجھ گھگھ کا۔ صر کڑا۔ گشتہ۔ کھا ترہ۔ محمد زالمی خٹا کر۔ صر۔

وہاں بھی بہت تھا۔ سڑک پر ۱۵۰ سے ۲۰۰ میٹر لمبی موٹری گاڑی تھیں۔ موٹروں سے پرے پارے ہزاروں میٹر لمبے جا بجا ہفت چارھ میٹر کے سیاہی بھی تھیں اور ہری ہری تھی۔ ان سے پرے بکرے کی ایک نہایت وسیع و عریض تصویر کے نیچے بکروں کی رامیں اٹھ رہی تھیں۔ بھلیں گڑبھلیں ٹھٹھٹے لگ رہے تھے۔

”پارہی تو بہت لوگ ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ ابھی جلد ملے گی۔“ یہ کہتے کہتے انور نے دور چڑی ایک میز کو خالی ہوتے دیکھا۔ ایک کرگیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ میز پر چھوٹی چھٹی برابریں ایک کراکڑی قمی جس کے سامنے والے ڈھکنے کو اس وقت بطور کمانے کی میز استعمال کیا گیا گھومتے ہوئے ابھی ایک کراچی اس پر بٹکنے ہوئے کھڑے کچھ کھڑاں۔

”بار! بار! اے اللہ بھی میرے بعد کا ہے۔“ عابد نے ارادہ کر رکھا تے ہوئے راکھ نظر ڈالی۔ ”کون سا واقعہ؟“

”میں نے کڑی کوشش کی اور اللہ“

“لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ”

اس نے مگر ارد گرد ایک نظر اعلیٰ۔ گاؤں کی گھاروں پر میزوں کرسیوں پر کھانے والوں پر۔۔۔۔۔ یار یہ بتاتے پہلے بہت

کہاں ہے۔ بچاں کو کہاں چھوڑا؟ اس پر اس مزید کی حالت فیر ہو گئی۔ میں اور جہاڑی چنگی دونوں گھبرا گئے۔ بھرا احتیاط برتی کر ایسا کوئی حوالہ درمیان میں نہ آئے۔

عمران میاں یہاں تین دن رہے مگر کیا رہے۔ نہ بولنا نہ ہنسا نہیں کم کم۔ تیسرے دن عمران میاں کو خیال آیا کہ میاں جہاڑی کی قبر پر چلا جائے۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹے تم چکیں برس بعد وادہ کی قبر پر ہاتھ پر ہاتھ کے ٹکرائیں میں اس طرف جانا قرین صلیقت نہیں۔ تم اس مٹی میں پیدا ہوئے ہو۔ بچائے جاؤ گے۔ اس پر وہ مزید زبردست ہوا اور بولا کہ بچا جان! میں گھبرا آنے سے پہلے جی میں محکم پھر گیا ہوں۔ اس مٹی سے مجھے نہیں بچنا۔ میں نے کہا کہ بیٹے اب ہی میں مالیت ہے کہ بیٹی نہیں نہ بچائے نہ خیر تو میں شام پڑے عمران میاں کو قبرستان لے گیا۔ جی قبروں سے میں نے متعارف کرایا پر مٹی قبروں کو انہوں نے خود پھینک لیا۔ اچھا میرا تھا اس نے بعض قبروں کی شناخت میں قدم سے وقت چوٹی آئی۔ میاں جہاڑی کی قبر پر پہنچ کر عمران میاں کا دل بھرا آیا۔ میری بھی آنکھ ہلک گئی۔ وہ قبر اب بہت کھوکھلی ہے۔ سر ہائے نکھرا ہوا ہار نکھار کا بچ کر چکا ہے۔ ہمیں یاد ہو گا کہ میاں جہاڑی کو ہار نکھار کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے باغ میں بہت شوق سے کٹی بٹ لگائے تھے اور ان سے اتنے پھول اترتے تھے کہ سال بھر تک مگر کی بچوں کے دوپٹے ان میں رہ گئے جاتے تھے اور ہر دعوت پر برائی میں ڈالے جاتے تھے پھر بھی بچا رہتے تھے۔ مگر ہار نکھار تو جہاڑی کا تھا ہے۔ میں اکیلا کس کس چیز پر توجہ دوں۔ ہار نکھار کا کیا غری بیٹھا تھا جو میاں جہاڑی کے سر ہائے نکھار وہ کیا تھا۔ جنگ سے پہلے والی برسات میں وہ بھی گر گیا۔ ہوا مارا باغ اور دارا قبرستان دونوں ہار نکھار سے خالی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ باغ بھارہ کیا تو کبھی بہت ہے۔ قبرستان سے متصل ہونے کی بنا پر قبرستان میں شہر ہوا اور ہاتھ سے جاتے جاتے بچا گیا۔ عمران میاں جس برس میں اسے بچ کر لے آئے اور ان کے ساتھ اتنی یادیں بٹھیں ہو گئی ہیں کہ اب اس باغ کو بھی قبرستان سمجھنا چاہیے۔ جو بچا ہوا رہ گئے ہیں وہ گزرے دنوں کے کتبے نظر آتے ہیں۔ ہر حال جہاڑی کا حال ہے وہ عمران میاں دیکھ گئے ہیں۔ ان کا کٹی گئے ہوں گے تو تو کیا ہو گا۔ یہاں سے تو وہاں کی گونچ پونچ گئے تھے۔ رات بھر میاں جہاڑی کی قبر کے سر ہائے نکھار کی گزاردی میں بھی بیٹھا رہا۔ جب بیٹھا ہوا اور چڑیاں بولیں تو وہ مزید بھر بھر لی لے کر اٹھا اور مجھ سے رخصت چلی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں جا رہے ہو؟ آگے ہو تو رہو۔ پچھلے پانے سے بولا کہ یہاں تو مجھے کوئی بچھا اتنا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ مزید اب نہ بچانے جانے ہی میں مالیت ہے کہ میری بات سے قائل نہیں ہوا۔ سڑاں پر سوار تھا۔ میں نے پوچھا "مگر بیٹے جاؤ گے کہاں؟" بولا کہ جہاں قدم لے جاؤ گے۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ کھٹھنہ جا کر وہاں سے کراچی جانے کی صورت نکالنے کی نیت ہے۔ دل تو بہت دکھا مگر کچھ اس کا صبر اور پھر میرا یہ ار کہ کہیں یہ خبر نہ

ہندوستان سے ایک خط

عزیز از جان سعادت و اقبال نشان رفودار کا مران طوعہ بعد دعا اور ترائے دیوار کے واضح ہو کہ یہ زمانہ خیریت جہاڑی نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بہت بے یقینی میں گزر رہا۔ میں نے تھک ذراغ سے خیریت بیچنے اور خیریت مکانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ایک چٹھی لکھ کر ابراہیم کے بیٹے یوسف کو بھیجی اور تاکید کی اسے فوراً کراچی کے پتے پر سمجھو اور دوسرے جو چٹھی آئے مجھے براہ راست (اک رات نہ کرو۔) ہمیں پتہ ہو گا کہ وہ کونیت میں ہے اور ابھی کئی کر رہا ہے۔ بس اس میں وہ اپنی اوقات کو بھول گیا اور پلٹ کر نکلی ہی نہیں کہ چٹھی بھیجی یا نہیں سمجھی اور دوسرے جواب آیا نہیں آیا۔ قلعہ مدین میں خاں کا چٹا لادن ہار ہاتھ تو اسے بھی میں نے ایک خط لکھ کر دیا تھا کہ اسے کراچی کے لیے لٹانے میں بند کر کے لندن کے لیے بھیجیں میں ازالہ دیتا۔ اس حرام خور نے بھی کچھ پتہ نہ دیا کہ خط اس نے بھیجا یا نہ بھیجا۔

سب سے زیادہ خوشی عمران میاں کی طرف سے رہی کہ وہ ہاں پہنچے یا نہیں پہنچے۔ پہنچے تو کسی طور تو انہیں اپنی خیریت کا خط بھجوانا تھا۔ احوال یہ ہے کہ عمران میاں دوسرے گزر رہے تھے۔ یہ جنگ کے دوسرا دور ہوا کی بات ہے۔ یہ سمجھو کہ وہ گلابی باز تھا۔ میں اپنا پتہ کمر سے سے اعلان میں لے آیا تھا۔ رات گئے دھک ہوئی میں پریشان ہوا کراچی خیر۔ اس خیر وقت میں کون آیا اور کیوں آیا۔ جا کر دور وہ کھولا دھک دینے والے کور سے بڑھ چکا دیکھا۔ حیران و پریشان کہ یہ کون آیا تھا۔ خون سے خون کو کچلا اور نہ وہاں اب بچانے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ جب میں نے اسے لکھ لگا یا اور کہا کہ بیٹے ہم نے تمہیں اس حالوں تو پاکستان نہیں بھیجا تھا تم کیا حال بنا کر آئے ہو۔ مگر پھر میں اسے کہنے پر آمادہ ہوا۔ یہ کیا کہ تھا کہ ہماری امانت ہمیں واپس مل گئی۔ بندے کو چاہیے کہ ہر حال میں شکر ادا کرے۔ حرف شکایت زبان پر نہ لائے کہ مراد انگریز بن جانے۔ اور کہنے والا اسحق مذاپ خیر ہے۔ انسان ضعیف اہلیان نے اس دنیا میں آنے کے بعد وہ کچھ کیا ہے۔ کہ اس کے ساتھ جو بھی ہوا اس پر شکایت کی کٹھن نہیں۔ آدمی بس چپ رہے اور حقیدار کے قبر سے زور تار ہے۔

جہاڑی چنگی نے عمران میاں کو دیکھا تو حق دق رہ گئیں۔ لکھ لگا یا اور بہت روئیں۔ میں تو چپ رہا تھا مگر وہ پوچھ نہیں کہ بھو

نکل جائے۔ سو میں نے مہر کیا۔ اپنے بازو سے دعا سے نور کھول کر اس کے بازو پر باندھی اور انہ کی حفظ و ایمان میں اسے رخصت کیا۔ چلتے چلتے تاکہ یہ کسی کمرہ سے لپکتے ہی جس طرح بھی ہو خیریت کی اطلاع دیتا۔ مگر وہ دن ہے اور آج کا دن خیریت کی خبر نہیں لی۔

اگرچہ خبر ادھر کم پہنچی ہے اور پہنچ بھی ہے تو اس طرح اس پر اختیار کرنے کوئی نہیں چاہتا۔ ایک روز فتح صدیقی حسن نے آ کر خبر سنائی کہ پاکستان میں سب سوشلسٹ ہو گئے ہیں اور پانچ پانچ روپے میریک ری ہے یہ خبریں کر دل بیٹھ گیا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ کس صاحب پرانے کا ٹھہر گیا تھا۔ پاکستان کے بارے میں جو خبر سنائی گئی تھی اس میں کسی کی سی بات نہ تھی۔ ان کے بیان پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ چند ہی دنوں بعد ایک ایسی خبریں لی جس سے میری افواہوں کی تردید ہو گئی؟ خبر سن کر مرزا نجف کو فیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ فتح صاحب کو میں نے یہ خبر سنائی تو وہ اپنا سامان لے کر رو گئے۔ اُنہ قولے پاکستان پر اپنی رحمت کرے اور اس قوم کو اس کی نیکی کی جزا دے ہم تو کفرستان میں ہیں۔ فیر اسلامی رسوم و اطوار رکھتے ہیں اور بول نہیں سکتے۔ ہماری حویلی سے قریب ہی فیر مقلدوں نے اپنی مہربانی ہے۔ وہاں وہ بلند آواز سے آہیں کہتے ہیں اور ہم چپ رہتے ہیں۔

ہاں فتح صدیقی حسن جہار سے متعلق بھی ایک مروجہ خبر لائے خبر سنائی کہ تم نے لکھی دعویٰ ہے۔ شک میں صوفی نے مجھے ہوئے ہیں اور ٹیلی ویژن رکھا ہے۔ یہ خبریں کرفوفی ہوئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ یہاں کی خلائی وہاں ہو گئی ہے۔ یہاں حویلی کا حال اچھا نہیں ہے کچھ لی رسات میں بھی ہوئی کڑیاں اور ہنک گئیں۔ دو اعانے کا حال تو یہ ہے کہ جہت کی طرف دیکھو تو آسمان نظر آتا ہے۔ ہماری بیکاری اور زبرداری کا حال جیسا ابھی طرح معلوم ہے۔ تم کچھ تو سمجھ سکتو مہاں جانی کی قبر کی مرمت کروئی جائے اور دیوان خانے کی جہت پمٹی اور ادوی جائے۔ اس سے زیادہ نی اٹال کرنا بھی نہیں چاہیے۔ حویلی کے عقدے کا کا حال فیصلہ نہیں ہوا۔ قبلہ بھائی صاحب مرحوم ۳۰ء میں چلتے چلتے عقدے سے کا کا تہ میرے چہرہ کر گئے تھے۔ اُنہ اُنہ کس وقت سے اب تک میں نے سب چیزیاں کا سامانی سے بھگت لی ہیں اور بیٹھ اپنی انکوں سے رجوع کیا ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ عقدے کا فیصلہ جلد ہی ہوگا اور ہمارے حق میں ہوگا۔ مگر بیک اہل کا چننا جس کس روز سر پہ آکھو ابھی بھی بہت لگتا ہوتا ہوں کہ میرے بعد یہ عقدہ کوں لے گا۔

جس طرف نظر ڈالو ہوں تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ ہمارے صاحبزادے اختر کے چہرے میں یہ ہیں کہ اپنا نام پر ہی رکھ لیا ہے اور ریخ پوچا کر ڈراموں میں پارٹ ادا کرتا ہے۔ چھوٹے بیسار محرم کی صاحبزادی خالدہ نے ایک ہندو نکیل سے شادی کر لی

ہے۔ اب وہ بے کھالی سے سادھی باندھی ہے اور ماتھے پر بندی لگائی ہے۔ پاکستان میں جو خاندان کا نقشہ ہے۔ وہ تم پر مجھ سے زیادہ روشن ہونا چاہیے۔ ساتھ کہ آج پانی کی لڑکی نرس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے اور جس سے کی ہے وہ اپنی ہے۔ خود آج پانی کا احوال میں نے یہ سنا ہے کہ وہ کھلے کھلے بیٹے کی موٹر میں بیٹھی ہیں اور بڑا دنوں سے مندرست ہاتھ کر کے کچر کھڑی ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے ایک میں ہی زندہ رہ گیا ہوں۔ قبلہ بھائی صاحب مرحوم اور چھوٹے بیسار دنوں اچھے دنوں میں مدحار گئے۔ جب میں قبرستان جاتا ہوں اور میاں جانی اور چھوٹے بیسار کی قبروں پر قافہ پڑھتا ہوں تو قبلہ بھائی صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ ایک وقت آیا ہے کہ اب ہم میں سے کوئی جا کر ان کی قبر پر قافہ نہیں پڑھ سکتا۔ جو خاندان ایک جگہ جینا چاہتا تھا وہاں اب کی قبریں جن قبرستانوں میں دفن ہوئی ہیں۔ میں نے قبلہ بھائی صاحب سے سوہ بانڈ عرض کیا تھا کہ اگر آپ میں چھوڑ دیں گے تو پھر مناسب یہ ہے کہ آپ کامران میاں کے پاس کراچی جائیں۔ مگر چھوٹے بیٹے کی محبت انہیں اُحا کر لے گئی۔ ان کی بے وقت موت ہم سب کے لیے بہت بڑا مصدمہ تھی۔ محراب میں سوچتا ہوں کہ ان کے جلدی اٹھ جانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ وہ ایک روح تھے قدرت کا یہ حضور نہیں تھا کہ وہ جبر و اجبر کے ان دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ ان تو مجھ پر گواہ کر دیکھتے تھے۔

اب جب کہ بڑوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے اور ہمارا خاندان ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ کر بکھر گیا ہے اور میں اب گور بیٹا ہوں سوچتا ہوں کہ میرے پاس جو امانت ہے اسے تم تک منتقل کر دوں کہ اب ہم قریب اس خاندان کے بڑے ہو۔ مگر اب یہ امانت حافطے کے واسطے ہی سے منتقل کی جاسکتی ہے۔ خاندان کی یادگاریں مع خمر و نسب کے قبلہ بھائی صاحب اپنے صہرو ڈھاکہ لے گئے تھے۔ جیسا افراد خاندان ضائع ہوئے وہاں وہ یادگاریں بھی ضائع ہو گئیں۔ حمران میاں یہاں بالکل خالی اچھ آئے تھے۔ سب بڑا اساتو یہ ہوا کہ ہمارا خمر و نسب ہم ہو گیا۔ ہمارے اجداد نے کس سادات حکام میں سے تھے۔ تاریخ میں بہت مصائب آہم دیکھنے کی مگر خمر سے کم ہوئے کا نام میں سنا تھا۔ اب ہم ایک آفت زدہ خاندان ہیں جو اپنا نکالنا اور خمر و نسب چکا ہے اور انتشار کا شکار ہے۔ کوئی ہندوستان میں کہیں ہوا کوئی بنگلہ دیش میں کم ہوا اور کوئی پاکستان میں در بدر پھرتا ہے۔ عقدے سے میں غفل پڑ چکا ہے۔ فیر اسلامی رسوم و اطوار پتا لیے ہیں۔ دوسرے مذہبوں اور فرقوں میں شادیاں کر رہے ہیں۔ یہی حال رہا تو خمر و عرس میں ہمارے خاندان کی اصل نسل بالکل ہی نابود ہو جائے گی اور کوئی یہ بتائے والا بھی نہ ہے گا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔

سوائے فرزند ان کہ ہم نجیب الطرفین ہیں حضرت امام موسیٰ کاظم سے ہمارا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ مگر اُنہ نہ کہ ہم رافضی ہیں بلکہ صحیح ائمہ علیہ السلام ہیں۔ اصحاب کبار کہتے ہیں اور اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں میاں جانی کا طریق چلا آتا تھا کہ عاشر

کے دن روزہ رکھتے اور ان بھروسے پہلے سے چلے جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں ایک قیمتی گچے کا شاعر کے دن مصرعے کے ہنگام سرخ ہو جاتا کرتی تھی۔
میاں جانی بتاتے تھے کہ یہ خاص اس مقام کی مٹی کے دانے ہیں جہاں ہمارے جد امجد سیدنا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام
گھوڑے سے فرش زمین پر آئے تھے۔ اس موقع کے سرخ ہونے کے ساتھ والد مرحوم کا انتظار بھی بڑھ جاتا۔ مگر میرے کوئی اور کر یہ سے
اجتاب کرتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ ہاں گھوڑے کی دیکھیں پکی جس جو فرما دوسا کین میں تقسیم ہوتی تھیں۔ تقسیم کے بعد جس ایک
دیکھ رو گئی تھی۔ پچھلے برس ہم اس ایک ایک دیکھ سے بھی گئے۔ قہول کا دیکھا پکایا اور فرما میں ہانت دیا۔ اگلے برس کا حال اللہ کو معلوم
ہے۔ مہنگائی بڑھتی جاتی جاتی ہے اور ہمارا حال سب سے بدتر چلا جا رہا ہے۔ بیٹے! تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ پاکستان میں بیڑا آپس کس بھاؤ
بک رہی ہے مگر ایک بات سن لو تمہیں چاہئے کہ ان لوگوں کے اخلاق کرنے گئے۔ جب ایک وقت آجائے تو بندہ کو چاہیے کہ وہ
استغفار کریں اور سچا دل کا پاک کر لیں کہ عاؤں کی ہمتیں کے کڑک میں غم رکھنے والوں کے لیے بہت ہی نشانیاں ہیں۔

خیر میں ذکر کرنا ہے خاندان کا کردار تھا۔ اس خاندان کا حصے میں نے اگلا بھی دیکھا مگر کھرتے ہوئے زیادہ دیکھا۔ بیان کا ہم
تینوں بھائیوں سے اپنے حضور بٹھا کر کہاں جانی کے خاندان کو یاد رکھنا کہ سو گندے بھانے رکھے۔ وہ فرماتے تھے کہ مجھ سے بیان
کیا میرے والد بزرگوار سید عاقلم نے اس وقت جب کہ ان کا وقت سفر قریب آیا۔ فرمایا اور جناب نے کہ مجھ سے بیان کیا میرے
باپ سید رحم علی نے اس تذکرے کے حوالے سے کہ جس میں ہمارے خاندانی حالات تمام وکمال درج تھے اور جو شائع ہو گیا اس
ہنگام جب کہ انہوں نے سندستان میں ہاتھ خراب کی چوکت کو چھوڑا اور برس خاک بسر و بدر بھرے اور حوالے سے ان
بزرگوں کے بیان کرتا ہوں۔ میں تم سے کہ ہم اصل میں اصفہان کی مٹی ہیں۔ جب آوارہ وطن ہشتاد ہجری میں اپنی سلطنت کے
حصول کے لیے اس دیار میں اپنا ٹکڑا راستہ کیا تو ہمارے مورث علی میر منصور دھرت کو خراب فرما دیے تھے اور علم اللہ یہ کہ مگر تیکر اس
تھے۔ اصفہان نصف جہاں سے اس ملک جناب کے ہم کا ب ہوئے اور عظمت کہ وہند میں پائی کرینا اور نور ایمان ہے۔ اکبر آباد میں
ان کا حراز آج بھی مربع خلائی ہے۔ قبر کی ہے۔ کنواں میں مٹی اٹھ کر ناگ میں ڈالتی ہیں جو برس کے اندر اندر ناگ کا سینہ دین
جاتی ہے خالی کو دیکھا بیان مٹی آٹھ میں پاندہ کر کے جاتی ہیں اور برس بعد ہری گود کے ساتھ وہاں آتی ہیں اور چار چڑھاتی ہیں۔
شاہجہان کے وقت میں اس بزرگ کی اولاد نے اکبر آباد سے رحمت سفر بھاڑا اور جہاں آباد پہنچی۔ پھر وہاں سے سندستان کی رستا خیز
میں لگی۔ ہمارے جد میر رحم علی نے اپنے دولت میں سے حوڑی ساتھ لی۔ جس گھر وہاں کو چلے کے ساتھ کر پر مضبوط پاندہا
کاغذات دستاویزات کا پاندہ بھل میں دیا اور نکل کمرے ہوئے اسی پندے میں خاندان کا تذکرہ لکھی تھا۔ راہ میں ہٹ ماروں سے

مقابلہ ہوا۔ اس افراغزی میں پاندہ بکھر گیا۔ کیونکہ کاغذات گر گئے۔ پاندہ گئے گر جانے والے کاغذوں میں تذکرہ بھی تھا۔ مگر شکر مد فکر
کہ شجرے کا حرف بھی ملتا نہ ہوا۔

بہت خاک چھانٹنے کے بعد اس مٹی سے کہ جہاں اب دیکھا اچھا خاک ٹھہرنے ہے۔ گزرا وہاں کی زمین کو میراں پا کر اڑ رہا
کیا۔ جانتا چاہیے کہ زمین جب میراں ہوتی ہے تو مجھ کی آغوش کی طرح نرم اور ماں کی گود کے سان کٹھن ہو جاتی ہے۔ جب نا
میراں ہوتی ہے تو جاہر حاکم کی مثال بنت اور حاسد کے دل کی مانند ٹھگ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے کہ اس زمین سے ایک مدت تک ہم پر دیا
کی۔ اس نے ہمارے بڑے بیٹے پچھلے خاندان کو رہا برس تک اس طرح اپنی آغوش میں بیٹھے رکھا جیسے تصرف پسند ماں بچوں کو سینے
سے لگا رہے تھی۔ یہ کہ اس کو آٹھوں سے مصل نہیں ہونے دیتی۔ تقسیم سے پہلے اس خاندان کے صرف تین فرد باہر نکلے تھے۔ بھائی
اشرف علی بھیا قادیانی اور چارے میاں۔ بھائی اشرف علی ہمارے چچا جانی کے بیٹے تھے اور عرقہ بھائی صاحب سے ایک سال
بڑے تھے۔ اس اعتبار سے ہمارے چچا ہونے کا شواہد سے ڈپٹی لکھتے تھے اور باہر کے اطلاع میں تعلیمات رہتے تھے خرد والی سہیں
پہنچتی تھی۔ بھیا قادیانی ان کے چھوٹے بھائی تھے اور میرے ہم عمر تھے۔ محلہ دیگات میں تھے۔ عری۔ پانی میں گزری۔ ہماری حویلی
میں لکڑی کا چھتا مسلمان تم نے دیکھا وہاں کا بنایا اور بھگوا یا ہوا تھا۔ دونوں بھائی فخر خاندان تھے۔ مگر باہر گزاری مگر آغوش آ رام اپنی
مٹی میں آ کر کیا۔

چارے میاں چھوٹی ماں کے لڑائے تھے۔ لڑا چار میں ایسے گھر سے کہ ساتوں میں کب کرنے لگے۔ ہمارے خاندان میں
وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے ہاتھ کھوپ دیکھا۔ ایک دفعہ میں بھی ان کے کہے میں آ کر بہک گیا۔ مادہوری کو کچھ کر دل بہت ہے قابو
ہوا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ چارے میاں آگے تک کے حوالے تھے۔ ہاتھ کھوپ شہر میں
آ گیا تو اس کے دیوان گئے۔

"بھئی کی بیٹی" کو دیکھ کر سلوچتا پر مرے۔ ایک روز چھوٹی ماں کی سونے کی ہاتھیاں چڑا کر گھر سے نکل گئے اور سیدھے بھئی پہنچے۔
میاں جانی نے کہا بھئی گھر کا صاحبزادہ اب دھرا کا رخ نہ کرے۔ بھئی میں ایک نئی ہے نہیں بھائی نہ دیا کہ جس میں سلوچتا سے ملاؤں گی۔
سلوچتا سے تو نہ لایا خود گئے پڑائی۔ ساری جوانی بھئی میں گزاری۔ چھوٹی ماں کے مرنے کی خبر پہنچی تو آئے۔ بڑا چاچا آ چکا تھا۔ بھئی
ستیدہ ڈاڑھی ہاتھ میں تھی۔ ماں کو بہت روئے۔ ہم سب نے کہا کہ اب تم نہیں رہو۔ بولے کہ میں جانی کی اجازت کے بغیر یہاں
کیسے نکل سکتا ہوں۔ میں جانی دینا سے پہلے ہی سدھار چکے تھے مجازت کو نہ دیا۔ مگر بھئی چلے۔ ۳۷ ملک چکا تھا اور گاڑیوں میں

خاڑے ہو رہے تھے۔ سب نے بہت کجما پٹ مانے۔ گاڑی میں سوار ہو گئے مگر بھیڑ تو پیچھے نہیں۔ جانے راستے میں ان پر کیا گزری۔

پیارے میاں! ہمارے خاندان کی طرف سے ۴۰ کے لبادات میں پہلی بیعت تھی۔ میں نے اہلداد و شاربغ کے ہیں۔ جب سے اب تک ہمارے خاندان کے انھیں افراد اللہ کو پیارے ہوئے انھیں مقتول ہوئے۔ نو طبعی موت مرے سات کو بنو نے ہندوستان میں شہید کیا۔ چودہ پاکستان جا کر برادران اسلام کے ہاتھوں اللہ کو مزاج ہوئے۔ ان چودہ میں سے ایک کو گریما میں ایب خاں کے انھیں کے موقع پر محترمہ قاضی جناح کی حمایت کرنے کی پاداش میں گولی مار دی۔ باقی ان افراد شرفی پاکستان میں ہلاک ہوئے۔ ان افراد میں میں نے عمران میں کو شہر نہیں کیا ہے۔ بندے کو اللہ کی رحمت سے عاجز نہیں ہونا چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہمارے دیگر کاٹھن اگر ابھی تک کراہتی نہیں پہنچا ہے تو کھنڈ و ہے۔ کھنڈ و سے یاد آ یا کہ بھلیا قاروق کا لڑکا شرافت بھی یہاں سے گزرا تھا وہ حاکم سے ٹکا تھا اور کھنڈ و جا رہا تھا کہ راستے میں یہاں رک گیا۔ بتایا گیا ہے یہاں ہے۔ اس سامنے نے اس پر ڈرا ہوا جڑا کر لیا ہو۔ جتنے دن یہاں رہا ہے محروک یا کھوکھ رہا۔ چلنے کے لیے تیار ہوا تو کھنڈ و کی بجائے بھیڑ کے لیے بسز باندا تھا۔ میں نے نہیں جانے کا سبب پوچھا تو کہا کہ وہاں راہنشاہ کھنڈ و سے ملے گا۔ میں نے کہا کہ وہ ہے سید ایمان اراہنشاہ کھنڈ و کو نہادی طور پر یاد آیا ہے جو تو اس سے ملنے کے لیے بہت تیار ہے۔ مگر اس نے میری ایک کان کنی اور دوسرے کان اڑائی اور بھیڑی روٹا ہو گیا۔ بعد میں اس کا لٹکا سے خبریت کا لٹکا آیا۔ چائیکس کن کن راستوں پر بھٹک کر وہاں پہنچا۔

شرافت کو زندہ رکھ کر خدا کا شکر یہ ادا کیا مگر اس کے چمکن و کچھ کر دل خوش نہیں ہوا۔ وہ اپنے میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں جا کر ہمارے خاندان کی لڑکیاں زیادہ آزاد ہوئی ہیں۔ میں تو جس لڑکی کے حلق میں ہوں وہی سنا ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے۔ ہمارے خاندان میں تقسیم سے پہلے سب ایک اتفاقاً ہوا تھا جو خاندان کو ہم کو یاد کر سکتا تھا مگر اسے بھی خوش اسلوبی سے یاد کیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی کی چھت پر ایک روز نکلتا آ کے گرا۔ اور ہم جانو کہ جس گھر میں کوئی لڑکی جو ان ہو رہی ہو اس گھر کی لڑکیاں میں روزے کا کرتا اور چھت پر کھڑے کاظم تھا کہ کچھ ابھی ملاحت نہیں ہے۔۔۔ ان دنوں چھوٹی چھوٹی کی بڑی لڑکی نے حدیث تھقل ریحی تھی۔ چھوٹی چھوٹی نے اس واقعے کا ذکر میاں جانی سے آ کر کیا۔ کتھوے کے ساتھ جو تھقل چھت پر گر گیا وہ بھی سامنے رکھ دیا۔ میاں جانی آگ بگولا ہو گئے۔ بہت کہے پرے کہ رضائل کے بیٹے کی یہ حال کہ تھقل چھت پر کھڑا گرا ہے۔ مگر جب چھوٹی چھوٹی نے اونچی بچ بھائی تو بچے پڑے۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ اس ادبش کے ساتھ دو میل پڑھا ہے جا میں اور لڑکی کو رخصت کر دیا جائے رضائل صاحب کو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس گھر کی بیٹی ان کی ہو سکتی

کی۔ حرت لکانا چڑھا مند ہو گئے مگر نہیں وقت پر سوال اٹھا کر صیف چڑھا جائے گا۔ میاں جانی خاں کا ساگھونٹ پٹی لپی کر کے دے مگر کیا کرتے ہاں کر دی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ خدیجی اولاد آدمی تھقل آدمی تھقل ہے۔ ایک گیارہویں شریف کی جائز دل ہے تو دوسرا عزم میں عزاداری کرتا ہے۔ مگر خیر اب تو ہمارا خاندان ہی ادا تھا تھقل و دھابھیر ہے اور سب عزاداری کی کھڑا ہوا رکھ گیا اور اصل نسل کا ادا تھا قمارت ہوا۔ خاندانوں میں یہ خاندان آگے کیسے پہچانا جائے گا۔ اب یہ خاندان کا ہے کہ وہ درست سے بھڑے ہوئے بچے ہیں کہ وہاں ماڈرنے چلے گئے ہیں اور خاک میں رولنے لگتے ہیں۔

عزیز! اب میں اڑتے چوں کا قائم دار ہوں۔ ان دنوں کو جب یہ خاندان برگ و برگ سے لہا کھنڈ اور سخت تھا۔ یاد کرتا ہوں اور آوارہ و چوں کا شکار کرتا ہوں۔ میں نے مرنے والوں ہی کے اہلداد و شاربغ نہیں کئے ہیں۔ جن کا زندہ میں شہر ہے۔ ان کو بھی شہر کیا ہے۔ سب کے سامنے چڑھ کر اور کھنڈ و کھنڈ کئے ہیں۔ تحقیق کی ہے کہ اس وقت کو ان اہل خاندان کس ملک میں آوارہ ہوئے اور کس گھر میں خاک بر سر ہے۔ یہ ہجرت بھرا چھٹا جس میں بھیجیں دوں گا۔ اپنا کیا اعتبار کہ چراغ سحری ہیں۔ چراغ بجھا جاتا ہے۔ اور آگ کھنڈ ہوا چاہتی ہے۔ تم اس سید بخت خاندان کے نئے چشم و چراغ ہو۔ اندھیرے میں بھیجئے ہوؤں کو اگر تم کھالے میں لانے کی سعی کرو تو یہ جہاد کی سعادت مندی ہوگی۔ دینے تو شاید سے میں بھی آ یا ہے کہ کھنڈ و کھنڈ کئے۔ مگر تھقل خاندان کبھی سننے نہیں دیکھے گئے۔ مگر کوشش کرنا انسان کا فرض ہے اس کو داند و خاندان کے سرد رہے غور آدموں کی خبر نہ رکھو۔ اب کر سکتے کھنڈ گئے ہیں اور کچھ بھی ایک پھیر لگا جاؤ۔ اپنی صورت دکھا جاؤ ہماری صورت دکھا جاؤ۔ جہاد کی جلی کا قاضی ہے کہ دہن کو ساگھوے کر آؤ۔ ہاں میاں! اکیلے مت چلے آؤ۔ اس ہائے قہار سے بچاں کو بھی دیکھ لیں گے کہ کس کی کیا اصل صورت ہے۔ کون گوردا ہے کون کالا ہے؟ ایک بات اور پاکستان جا کر اس خاندان میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی تفصیل میں نے ہاں کی مدد تک قلم بند کی ہے۔ شکل و صورت کے کو کھنڈ ورت نہیں کئے جاسکتے۔

یہ خاندان خود پر کر لیا۔ اس ادا کی ہوئے تین سال کے عرصے میں جو خاندان میں کی پیشی ہوئی اس کا اندازہ ہی ضروری ہے تم میں کر دو اس عرصے میں ادھر گزر گئے اور جو تازہ و دار ہوئے ان کی تفصیل معلوم کر کے مجھے کتھوے۔ میں الگ الگ کہاں خط کتھوں۔ ڈاک کھل تو ہے مگر اتنی کھل کہ تھقل سا پست کارا لکھتے ہوئے بھی بے گنتا ہے کہ تار برقی کھنڈ رہے ہیں۔ یہ کیاں رہا ہوں کہ خدیجی چھوٹی بیٹی نے شہر سے ضلع لے لیا ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں بھرتی ہو گئی ہے خود کو کام سے کئی دوسروں کے وحیفہ زودیت میں کھنڈ و ادا کی جاتی ہے۔ ہاں میاں! شہر تو کھو یا گیا اب یہ خاندان جو بھی کرے تھقل ہے۔ مگر سنا ہوں کہ دوسرے خاندانوں والے اس سے بڑھ کر کر رہے ہیں۔ کوئی تار ہاتھ کا ہاتھ لہر لہر آئے میں نے چوری اور چری میں کس کا ایک منزل بنائی ہے! اور میاں! فیض الدین نے کہ یہاں پہلے خانوں چلے گئے کالے پے سے کو لکھیاں کھڑی کر لی ہیں! میں پوچھتا ہوں کہ کیا پاکستان

"کیا شام کا کچا میرے لیے کرنے کا ہے کیا۔"

"پھر تم شام کو میری طرف آ جاؤ۔"

"آ جاؤں گا۔"

"اسلم کو کون کروں گا۔ وہ بھی آ جائے گا۔"

"اسلم بھی؟" "نہ سے وہ نہیں ہے۔"

"اسے مذاق نہ مت اسے کہاں جاتا ہے"

"اور نہ ہی کہاں ہے۔"

"اچھا اس کھانے کو بلاؤں گا پھر کچا رہی؟"

"جی۔"

ظفر نے کمر باندھی کرتی ہی سے اڑاں گھمایا "ہیلو اسلم۔ یار میں ہوں ظفر۔ یار سلطان آ گیا ہے۔"

"سلطان؟..... یار کیا کہہ رہا ہے۔"

"ہاں ہاں یار وہ آ گیا ہے؟"

"وہ ہاں سے ٹک کر ٹکڑا آ یا مگر کیسے؟"

"شام کو آؤ اور اس سے غور پوچھ لو۔"

"آؤں گا۔"

پھر اس نے زہدی کے دفتر فون کیا "ہیلو زہدی۔ بھی زہدی صاحب کو بلائیں..... ہیلو زہدی..... میں ظفر۔ یار میں ایک

خبر سناؤں۔"

"سناؤ۔"

"سلطان آ گیا ہے۔"

"سلطان..... نہیں ہے۔"

"ہاں یار وہ ٹکڑا آ رہا ہے"

"بہت مونی کمال کا لفظ۔ پھر کہاں ہے وہ؟"

"شام کو میری طرف آ جاؤ۔ وہ آئے گا۔"

"آ جاؤں گا۔"

شام کو چاروں یار اکٹھے ہوئے۔ سچوں نے سلطان کو اور سلطان نے ان تینوں کو ایک حیرت سے دیکھا۔ اسلم نے اس کے پیچھے پر پہلے انکسار تجب کیا پھر وہاں کے حالات پر انکسار انکسوں کیا۔ پھر اسے فہرہ آچھا گیا۔ "لوگوں کو انہوں نے کیسی کیسی باتیں دے کر مارا ہے..... ہزاروں کو بچان کو محروم کو..... قحطی..... درندے..... میرا پس پلے تو میں انکس....." اس نے دانت کچکا پائے۔

"انکس بھی کرنا چاہیے تھا۔" زہدی نے اعلان کیا۔

"بھی کرنا چاہیے تھا۔" اسلم فہرہ سے بولا۔

"ہاں ہم بچیں سال تک ان کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے جس کے بعد انہیں بھی کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا کرتے رہے تھے۔ کیا کیا قہارم نے ان کے ساتھ اسلم فہرہ سے بولا۔

پھر اسلم نے اخباری رپورٹوں کے اگلے سے ان کے مطالعہ کی تفصیلات سنا کیں اور زہدی نے بے تحاشا اٹھ دو ہجرا بیان کر کے اپنی طرف والوں کے استہصال کو ثابت کیا۔ سلطان نے ایک لمبی سہاٹی لی۔ ظفر نے اس کی طرف دیکھا۔

"سلطان قہار کیا خیال ہے۔ تم بتاؤ۔"

اس نے ظفر کے منہ کی بات لپک لی۔ "ہاں سلطان سے پوچھو۔ یہ تو وہاں اسے عرصے رہا ہے۔ اس نے سارے حالات دیکھے

ہیں۔ سلطان قہار کیا خیال ہے۔"

"میرا کیا خیال ہے" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اسے خاموشی دیکھ کر ظفر آخر بچپن میں ہوا سے فہکا۔ "یار کچھ بڑا۔"

"کیا ہوں۔"

زہدی ظفر پر فہمی ہنسا "کوٹ منٹ سے ڈرتا ہے"

"کوٹ منٹ" وہ زہدی کا منہ جھٹکا۔

اسلم نے زور دے کر کہا "آفریقہ تو بچے کر تم اس بارے میں کیا سچتے ہو۔"

اس نے اک تہ جذبہ کے ساتھ کہا "یار کچھ بھروسہ نہیں آتا۔"

ظلم نے ابھی سنا ہے دیکھا "مجھیلے برس جب تم آئے تھے تو ہم نے وہاں کے حالات کا تجزیہ کر کے میرا دماغ چاٹ لیا تھا۔

وہ ہنسنے لگا۔ بھر مری ہوئی آواز میں بولا "اس وقت میرا گانہ یہی تھا کہ میں نے حالات کو سمجھ لیا ہے۔"

”اچھا چھوڑو اس قہرے کو۔“ پھر نے کہا ”تم یہ بتاؤ کہ وہاں ہوا کیا۔“

”ہاں یہ میں جانتا تھا کہ اس نے مستحوی ہے کہا۔“

”میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں اسے سناؤں تو تمہارے دل تک پہنچے گا۔“ وہ کہہ کر ایسے چپ چاپ اسی کوئی لمبا داستان سنانے کی تیاری کر رہا ہے۔ تینوں بزرگ نہایت گھوٹی گھونپنے۔ انتظار کرتے رہے کہ اب شروع ہو گا اور اب شروع ہو گا۔ مگر وہ بالکل چپ تھا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو ظہار نے ”شوکا“ یا راز تو چپ ہو گئے۔

”ہاں ہاں۔“ اس نے چیخاۓ لہجہ میں کہا ”کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

اسلم اور یزیدی دونوں نے اسے فضیلی نظروں سے دیکھا اور پھر اس سے بے تعلق ہو کر ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے۔

بحث گرم ہوتی چلی گئی۔ خود و ترمیش۔ قصہ ہاشم نکلا۔ ابھی ادھر سے ابھی اُدھر سے ۱۵۵ میں فخری طرف سے کوئی بھرے گا ابھی اس طرف والوں کے لیے ابھی اس طرف والوں کے لیے دو دستہ بارہ دستوں کا منہ نکلتا رہا۔ پھر اس کے بچے نے ہماری ہونے لگے۔ ایک دفعہ اچھا لگا۔ پھر فرمایا وہ مستعد ہو جیسا اور ایک بات غور سے سنئے گا۔ مگر تھوڑی سی دیر میں اس کے بچے نے پھر ہماری ہونے لگے اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

"حاضر اے۔ سامراجی کتے"۔۔۔۔۔۔ زیدی نے زور سے میز پر مکا ہوا

”سب ممالے خدا رکھے۔ ہندوستان کے انجینئر“ اعظم نے مجھے سے کہا سلطان نے دلوں کو خند بھری نظروں سے دیکھا اور پھر سو

آخروہ اس وقت الحاح جب جائے سامنے آگئی اور پھر نے اسے فہوکا "سلمان جائے"۔

اس نے بڑا کر آٹھویں کھینس کھولیں۔ حضرت طلب نکلواں سے اداستوں کو دیکھا اور مستعد ہو بیٹھا۔ آنکھوں پر نرمی سے انگلیاں

کمال و مبالغہ کے درجے کھٹے چٹے ہر ہے ہوں۔ کہنے لگا۔

”اچھے سونے پر ان دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ اس رات ایسا ہوا کہ میں بالکل فیض ہو گیا۔“

کہنے کہنے کا داشت بھرے منظر تجوی سے اس کی تصویر میں ابھرے اور ایک غیر انسانی سی فلیش اس کے دماغ میں گونج گئی۔

”یہ کس راست کا ذکر ہے۔ زوال ہو چکا تھا؟“ اسلم نے سوال کیا اس نے سوچا بلکہ کہا ”خبیث یا نہیں کہ وہ نوئی رات تھی۔ ویسے وہ سب راتیں ایک ہی تھیں۔ ہوا یہ کہ“ ”کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔ اسلم زیدی نے نظر تیز اس کی طرف متوجہ تھے۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ ششپالا ہوا۔ ”آئی بات وہیں سے آگئی۔ بہر حال اس کے بعد میں راست بھرتہ سوسکا۔“ زکا بھر اس کا۔ ”تو بھر اس کے بعد تو“

یہ ہوا کہ سونا نصیب ہی نہیں ہوا۔ شاید پھر سو یا علی نہیں ۔۔۔۔ یا شاید کبھی سویلیا ہوں۔“

اسلم زیدی غفرلہم نے بے یقینی سے اس کی بات سنی۔ چاروہ آج بس میں تھک گئے اور دوسری بحث کرنے لگے کہ ادھر والوں نے ان کا احوال کیا؟ ادھر والوں نے نہاری کی اور وہ بیٹھا بیٹھا یہ یاد کرنے کی کوشش کر کے لگا کہ ان راتوں میں وہ کسی راستہ پر تھا یا نہیں سو گیا تھا۔ اسے کچھ یاد آتا ہے۔ اور یہاں آئے کے بعد۔ جیسے آئے کے بعد کبھی سونے کا حساب وہ فلکی نہیں لگا سکا۔

اس صاب سے تھک کر وہ اسلم زیدی اور ظفر کی بحث پر متوجہ ہو گیا۔ سدا رہا سدا رہا۔ سننے سننے اس نے ایک بیباکی اور فطرتاً
 آمیز آنگھوں سے ظفر کو کہتے ہوئے کہا۔ ”پار مجھے خنڈا رہی ہے۔“

ظفر نے بے حرج ہو کر اسے دیکھا۔ ہجر مرآت میں کہا۔ "تو کچھ سوچاؤ۔"

”ہاں میں اس سوانہ چاہتا ہوں۔“ اس نے جلد بولتی آنکھوں کے ساتھ خند بھری آواز میں کہا۔ آگے ٹھٹھک کر صوفے کی نشست پر لگا اور دیر بہر پر پچھلا لیجے۔ اس طرح کہ اس کی ایک خست حال جوتی کلم کے مقابل قحطی اور دوسری جوتی کی لوہک زہدی کے رو بہ رو اور دوسرا نے لٹے گا۔



بچوے

برہمن کے جانے کے بعد وہ تاری مکمل کھلی۔ چوہنے طوطے نے اسے نوکے کے لیے پرتوے بڑے سے کہا کہ بدھ صوفیوں میں مست بول۔ یہ چھوٹا نہ بانا اور تاری کو ٹوک بیٹھا۔ اس چار تاری نے بھولی بن کر کہا کہ اچھا اب میں کوئی پاپ نہیں کروں گی تو نے ٹوک دیا اچھا کیا۔ باہر آجھے چار کروں وہ بھولا باہر آ گیا۔ تاری نے نصیحت اس کی گردن مروڑ دی۔

جب دونوں بعد برہمن واپس آیا تو اس نے بڑے سے پوچھا کہ میں مضمون تھاری مانتا ہے میرے پیچھے کیا کیا۔ طوطا بولا کہ مہاراج جہاں کھوت ہو وہاں بدھ صیانت چہرہ ہے جس کی کہ انکی اسوتھ میں بولنے میں جان کا ٹککا ہے۔

طوطے نے یہ کہہ کر ہی میں سوچا کہ جہاں بول نہیں سکتے جہاں بیتا اور جین ہے۔ وہاں چلو جہاں بول سکو۔ یہ پھر بھڑانے برہمن سے کہا کہ مہاراج لفظ صتم بولے برہمن نے پوچھا کہ میں مضمون کہاں بولے۔ بولا کہ وہاں جہاں بول نہیں۔ یہ کہہ کر بدھ صوفی بتا جس کی بھری ہنسی کو چھوڑ جنگ کی اور اڑ گئے۔

یہ جانک ستا کر وہ بڑا سا گر شال بڑے کے نیچے سے اٹھ آگئے چل پڑا چلتا رہا۔ کالے کوسوں جا کر ایک زرخیز بن میں اس کیما۔ سندھو راہو گوال بھی برک سرخ کھینچے پیچھے وہاں پہنچے۔

وہ بڑا سا گر تین رات جیران مارے آگھیں سو نہ بے کھائے پئے بیٹھا رہا۔ چوتھے دن سندھو راہو گوال اپنے اپنے کھٹکا پاتر لے کر اس بن سے نکلے اور شام بڑے بھرے کھٹکا پاتروں کے ساتھ واپس آئے۔ وہ بڑا سا گر کے پاس بیٹھ کر بولے "بے وہ بڑا سا گر کیا تھا گت نے نہیں کہا تھا کہ پیٹ بھر کے کے لیے کھاؤ اور پیاس بجھانے کے لیے پئے۔"

یہ سن کر وہ بڑا سا گر نے آگھیں کھولیں جو سامنے رکھا تھا اسے کھا ایسے جیسے اس میں کوئی سواد نہ ہو اور نہ ہی کا نزل مل جائے جیسے وہ گرم پانی ہو۔ پھر کہا کہ کئی کوئی میں اور بن کیا۔

سندھو راہو نے یہ مضمون اچھا مانا اور کہنے لگا کہ "بے۔ وہ بڑا سا گر بھکشت چتہ سے بھر گئے ہیں۔ تخامت کے بتائے ہوئے نبول کا پاں نہیں کرتے چڑی جھاڑیں چھوڑی پھٹوں سے اونچی کھانوں پہ آرام کرتے ہیں۔ ایک عمو کے اندر کتنے عمو بن گئے اور کتنی منڈ لیاں پیدا ہو گئیں۔ برہمنوں دوسری منڈی کی جان کی جیڑی ہے۔ تو پختہ چل اور انہیں کشادہ کرے کہ تو ہمارے چل گئی اور گیانی ہے۔"

وہ بڑا سا گر بولا کہ "بے سندھو راہو نے جی کی جانک سنی ہے؟"

"نہیں"

وہ بڑا سا گر چپ ہو گیا تھا۔ اس نے بھکشتوں کو اونچی آوازوں سے بولنے سنا لاتے دیکھا اور چپ ہو گیا۔ سنا رہا اور چپ رہا۔ پھر ان کے چلے سے اٹھا اور گر سے باہر گرگرسا میں سے دور ایک شال کے بیچ کے پیچھے ہانڈی لگا کر بیٹھ گیا اور کنول کے ایک پھول پر نظریں جمائیں جو چھوٹا مسکا یا اور سر ہما گیا ایک پھول کے بعد دوسرا پھول دوسرے کے بعد تیسرا پھول جس پھول پر وہ درشتی مچاتا اور پھول مسکا یا اور سر ہما جاتا۔ یہ دیکھ کر اس نے شوک کیا اور آگھیں سو نہ لیں۔ لندن آگھیں سو نہ ملے بیٹھا رہا۔

دونوں بعد بیٹے دونوں کے کھٹکی سندھو راہو گوال کے پاس آئے بولے کہ "بے وہ بڑا سا گر تم دکھ میں ہیں۔"

وہ بڑا سا گر پر شانت صورتی بنا بیٹھا رہا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ گوپال لاشمی آواز میں بولا۔ "کیسا اندھیر ہے۔ کہ نہیں نہیں بولنا چاہیے وہ بہت بول رہے ہیں آگھیں بولنا چاہیے وہ چپ ہو گیا ہے۔"

اور سندھو راہو بولا۔ "سو بعد اسے کہا اور انہوں نے کیا۔ سو بعد اسے کہا تھا کہ تخامت اب ہمارے چل نہیں ہے وہ سندھو راہو رہتا تھا کہ یہ کرو اور یہ مست کرو۔ اب جو ہمارے جی میں آئے گی وہ ہم کریں گے۔ بے وہ بڑا سا گر اب سب بھکشتوں کی کرتے ہیں جو ان کے جی میں آتی ہے اور ان کا جی ترش کے بھگل میں ہے۔ گھاس کا سبز انہوں نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کھات پے سوتے ہیں۔ اور ہمارے چل بیٹھے ہیں۔ بے گئی ہے گیانی تو کیں نہیں بولتے۔"

وہ بڑا سا گر نے آغوا آگھیں کھولیں۔ سندھو راہو گوال کو فور سے دیکھا۔ پوچھا "بندھو راہو تم نے طوطے کی جانک سنی ہے؟"

"نہیں"

"تو پھر سنو۔" وہ بڑا سا گر نے کہا "چتے سے کی بات ہے کہ ہماری برہمنوں کا راج تھا اور ہمارے بدھ و جی نے طوطے کے روپ میں غم لیا تھا۔ طوطے کا ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ دونوں چوہنے سے تھے کہ ایک چڑی مارنے انہیں بکا اور ہماری کے ایک برہمن کے ہاتھ لگا دیا۔ برہمن نے دونوں طوطوں کو ایسے پالا جیسے اولاد کو پالتے ہیں ایک بار برہمن کو پردیس جانا چاہا۔ جاتے ہوئے طوطوں سے کہ گیا کہ مضمون تک اپنی مانتا کا وہ بیان رکھتا۔

دعوت بھی تھا۔ اس نے بھی اس سے بندہ کا جنم لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ ہی جنم میں بدھ کا کام تمام کر دیا جائے وہ اس زور سے بدھ مت کی کیچے پکڑا کہ وہ دھوٹے ہو گئے۔

راجہ بے سب تکھد کچھ ہاتھ اس نے بھڑی سے بدھ مت کی کو اوپر سے نیچے اتار آگیا میں اٹھان کر کے زور دیا اڑھا دیا۔ سو گندھ لگائی اور وہ اوارہ پائی۔ بھران کے چرخوں میں جیڑا اور کہا کہ بے بندہ راجہ تو اپنی پر جا کے لیے لے لیا، تاہم تیری پر جانے تیرے ساتھ کیا کیا۔ بدھ مت کی بات ہے کہ راجہ اس میں تیرے لیے ایک سکھ ہے۔ راجہ کو چاہیے کہ پر جا کو دیکھ نہ ہو نہ دے چاہے اس کا دن اسے جان باری پڑے یہ کہ کے بدھ مت کی نے آخری جنگلی اور بندہ کے خم سے دوسرے خم میں چلے گئے۔

اس جا تک نے وہ ایسا کر ستر ستر بار اور کپاں تھیں کو کچی کر دیا۔ انہوں نے شوک کیا کہ تھا کہ نے جگ کونستہ رنے کے کا دن کئے جنم لیے اور کیسے کیسے دکھ ہو گے پر ہر خم میں دعوت ایسے ڈھٹ پیدا کرتے رہے اور تھا گت کے لیے کھٹیا نیاں پیدا کرتے رہے ستر ستر دنے پوچھا۔ "یہ وہ ایسا کر" کیا دعوت بدھ دیتی کہ بھائی نہیں تھا۔

"بھائی ہی تھا۔" یہ کہہ کر وہ ایسا کر پہلے جیڑا بھر دیا۔

"یہ کیانی تو ہنسنا کیوں اور وہ کیا کیوں؟" گو پال نے پوچھا۔

"جب بکری نہیں اور روکتی ہے تو میں کہ منٹ جاتی ہے میں کیوں نہیں اور روکتی سکتا۔"

ستر ستر دکھ کر بھائی۔ "بکری کیوں نہیں اور کیوں روکتی۔"

وہ ایسا کر نے جواب میں ایک بکری جا تک سائی۔ "یہ ستر بیچے سے کی بات ہے کہ بتاؤ میں ہر ہم دت کا راج تھا۔ ایک برہمن نے کہہ دیوں کی وہ ایسا راجہ تھا سو دوں کو بھونڈ دینے کے دھیمان سے ایک بکری خریدی۔ بکری کو اٹھان کر گایا میں بھرا ڈالا۔ بکری اپنے جینٹ کی یہ تیار کیا اور کچھ کر پہلے اپنی بھروئی۔ برہمن نے پوچھا کہ بکری تو قسم کیوں اور روکتی کیوں بکری بولی کہ۔ "یہ برہمن کا خم میں بھی برہمن تھی اور میں بھی دے دیوں کی وہ ایسا ہی ہوئی تھی اور میں نے بھی ایک بار سو دوں کو بھونڈ دینے کے لیے ایک بکری کی تھی اور اس کا گھٹا تھا۔ پر ایک بار بکری کا گھٹا کٹنے کے بدلے میں میرا گھٹا پانچ سو بار کا گیا۔ آج پانچ سو ایک سو بار میرے گھٹے پر چھری بھرے گی۔ میں یہ دھیان کر کے قسم کی تھی کہ آج آخری بار میرا گھٹا کٹا رہا ہے اس کے بعد اس کے میرا گھٹا راجہ جائے گا اور میں یہ دھیان کر کے روکتی کہ میرا گھٹا کٹنے کے بدلے میں اب تجھے پانچ سو بار گھٹا کٹا نہ دے گا۔"

برہمن بولا کہ۔ "یہ بکری تو اسے ستر میں تیرا گھٹا نہیں کٹا توں گا۔"

"تو سن۔ اگلے ختم کی بات ہے کہ بتاؤ میں ہر ہم دت برا جاتا تھا اور وہارے بدھ دت کی جتا کے ختم میں بھگل میں اس کرتے تھے۔ ایک بڑی کی بھی اپنی میں ایک ستر گھٹا بنا دیا اور اس میں رہنے سہنے گئے۔ ایک بار بہت دور شاہوئی۔ ایک بندہ بھگتا ہوا کہیں سے آیا اور اسی قطر پر جتا کے گھٹا کے برابر بیٹھ گیا پر یہاں بھی وہ بندوں سے بھگت رہا تھا۔ "بنا ہوئی کہ" ہے باندر دیسے تو آدمی کی بہت نکلی کرتا ہے۔ مگر مگر بتانے میں اس کی نکلی کیوں نہیں کرتا۔ آج تیرا مگر ہوتا تو درشا ہے تیری دور شا کیوں ہوئی۔" بندہ بولا کہ "جیڑی جتا میں نقل کرتا ہوں پر محل نہیں۔" مگر بھندر نے یہ کہنے کے بعد سوچا کہ جتا اپنے مگر میں بھی جتا میں بھاری ہے اس کا مگر نہ ہوا اور میری طرف نیچے۔ بھار دیکھوں کیسے جتا میں ہے۔ یہ سوچ کے اس نے جتا کے گھٹا کو کھسٹ ڈالا۔ بدھ مت کی اس سولہ اوارہ جینٹ میں مگر سے بے مگر ہو گئے۔ انہوں نے ایک گھٹا پڑی جس کا تہ ہے کہ ہر اے سے میرے کو نصیحت کرنا مفت میں نصیحت مول لیا ہے یہ گھٹا پڑ جتے وہ اس بھگل سے پہنچتے ہوئے دوسرے بھگل کی اوڑ گئے۔"

وہ ایسا کر نے یہ جا تک سن کر غصہ سانس بھرا اور کہا کہ بدھ دت کی نے بندوں کے ساتھ کیا کیا اور بندوں نے بدھ دت کی کے ساتھ کیا کیا۔" مگر یہ جا تک سائی۔

"بتاؤ میں اس کے راج سکھان پر ہر ہم دت برا جاتا تھا اور بدھ دت کی نے بندہ کا خم لے کر بھگل بنا دیا ہوا تھا بڑے ہو کر وہ ایک موٹے تازے بندہ ہوئے اور راجے آموں کے باغ میں بیٹے والے بندوں کے راجہ سہنے۔ ایک ہاتھ آموں کی رت میں راجہ باغ میں آیا اور بندوں کو دیکھ کر بہت لگا کہ وہ آموں کا ناش کر رہے ہیں۔ اپنے پارھیوں سے کہا کہ باغ کے گرد گھیرا ڈالو اور ایسے تیر چلاؤ کہ کوئی بندہ بھاگ نہ جائے۔

بندوں نے یہ بات سن لی۔ بدھ مت کے پاس گئے اور پوچھا کہ باندر راجہ کتاب ہم کیا کریں۔ بدھ مت کی نے کہا کہ چتا مت کرو۔ ابھی اچانے کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک ایسے چل چڑھے جس کی ہنسیاں گنگا کے پات پدور تک پہنچی ہوئی تھیں۔ پات پ پھلی ہوئی آخری پہلی سے دوسرے کنارے چھلا گیا گنگا کے فاصلے پاور اس پات کا ایک ہاتھ تو زور دیا پانی کی ایک جھاڑی سے ساتھ پات کے اوپر سے آسمان کی تک گانے کا جنم کیا۔ پر پات میں تھوڑی سی چمک ہو گئی۔ اس اور میں کے کچھ ان کے دھو برابر کا صلہ دیا۔ بدھ مت کی نے کیا کیا کہ ہاتھ کے کٹنے کے ساتھ اپنی ایک تگ ابھی اور اگلے آسمان کی پہلی پکڑی۔ بندوں سے کہا کہ "لو میں لیا بن گیا ہوں۔ تم میرے اوپر سے ہو کے ہاتھ سے گنگا پار کر دو جاؤ۔"

باغ میں مگر سے ہوئے اسی جزا بندہ بدھ مت کی کی چیت سے کچھ گزرے یہ سوچ کر کہ انہیں دکھ نہ پہنچے پر بندوں میں

کبری زور سے فحشی اور بولی کہ "مجھ کبری کا گھٹا تو کتنا ہی ہے تیرے ہاتھوں نہیں کئے گا تو کسی اور کے ہاتھوں کئے گا۔"

برہمن نے کبری کی کئی ان کئی کی۔ اسے آزاد کیا اور چیلوں سے کہا کہ دیکھو اس کی رکھیا کرو۔ چیلوں نے اس کی بہت رکھیا کی پر ہوئی اور کبری۔ اس کبری نے جتے جتے چارے ایک بڑی کھٹی پھرت مارا۔ وہ بڑا اس پر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔

یہ سب تو اب سنو کہ اسی بڑے کے برابر ایک سندھ بڑھ کھڑا تھا۔ یہ بدھ صیبتی تھے۔ جنہوں نے زور کے روپ میں جنم لیا تھا۔ انہوں نے تر تہ زور کا جنم چھوڑا اور اس کے بچے آسن جھاکے چیلے جٹانے پید کچرا چنچا کیا اور انکھی ہونے لگی۔ بدھ صیبتی نے اس گھڑی ایک مشکل کا تھا پانچویں جس کا تھہر یہ ہے۔ کہ پر شو پسا کا انت دیکھو جو در سے کا گھلا گئے گا ایک دن اس کا بھی گھلا جائے گا۔"

سندھ اور گرو پال نے یہ جانک دھیان سے سنی اور شرمنا سے سر جھکا لیا۔ مگر پھر سندھ اور پال کہ "ہے گیانی میرا سوال جنوں کا توں ہے۔ کیا بدھ صیبتی کا بھائی نہیں تھا۔"

وہ بڑا سا گر بولا "ہے سندھ نہ یہ پرشن مت کہ نہیں تو میں بھر پہلے جنوں کا اور بھراؤں گا۔"

"ہے گیانی تو کیوں کہتے گا اور کیوں روئے گا؟"

"میں یہ بتا کے جنوں کا کہ بدھ صیبتی کا بھائی تھا اور یہ دھیان کر کے دوں گا کہ وہ بھٹکھو گی تھا۔"

سندھ نے یہ سن کر وہ بڑا اور بولا کہ "ہے پر بھٹکھو کھٹکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔"

وہ بڑا سا گرتے سندھ روکھو کہ دیکھا "ہے سندھ نہ یہ پست بچ چھ۔"

"کیوں نہ بچ چھوں۔"

"مت بچ چھ کہ کبھی میں بھی ہوتا ہے کہ برائی کا کھون کر کے کرتے انت میں میں اپنی ہی آپا رکھائی دیتا ہے۔"

"یہ کیسے؟"

"یہاں ہے کہ بتاؤں کہ راجہ برہمن بدھ کی رانی کسی دوسرے سے مل گئی۔ راجہ نے اس سے بچ چھ گھڑی تو اس نے کہا کہ میں کسی پرانے سے ملی ہوں تو میں مرنے کے بعد چیل بن جاؤں اور میرا منہ گھڑی کا ہو جائے اور ایسا ہوا کہ رانی مرنے کے بچ چھ چیل بن گئی اور اس کا منہ گھڑی کا سا ہو گیا اور ایک بن میں ہا کے ایک کھوہ میں رہنے لگی۔ آتے جاتے کو بھڑائی اور کھائی۔ ایک دن ایک برہمن کھٹکھٹا سے وہ باہر پتہ کر کے آ رہا تھا چیل اسے کمرے لاد کے اپنی کھوہ میں لے جا کے اس سے پھینکے گی۔ برہمن دھواں تھا۔ پر جو ان بھی تو تھا۔ وہ اپنی جگہ جاتی اپنی جگہ۔ وہ بھی کر گیا۔ چہا پانچائی کی اور بھوک کیا اس بھوک سے چیل کو کچھ رہا۔ نو مہینے بعد اس نے

پتر جٹا۔ یہ پتر داس تو میں ہمارے جد جہاں رہا تھا تھے جنہوں نے اب کی بار چیل کے پتر کے روپ میں جنم لیا تھا۔

بدھ صیبتی نے بڑے ہو کر باپ کو چیل کے چنگل سے نکالے اور منٹن جاتی کے بچ جانے کی فہمی چیل نے کہا میرے لال تو نے منٹن جاتی کے بچ جانے کی فہم ی ملی ہے تو اپنی میا کی بات سن لے کہ چیلوں کے بچ کر زور کرنا آسان ہے آدمی کے ساتھ گزارہ کرنا کھن کا کام ہے میں تجھے ایک نوک لانا بتائی ہوں اور جو اس دنیا میں تیرے کام آئے گا۔ اس نوک کے کل پتہ آدمی کے پاؤں کے نشان ہمارا کھونٹ تک دیکھ سکتا ہے۔

اپنی میا سے یہ نوالے کر پتہ پتا کے تنگ بنائیں پہنچو اور اپنا منٹن بتا کے راجہ کے دو بار میں چاکری کر لی۔ دو بار میں نے یہ دیکھ کر کھسک پھری اور راجہ سے کہا کہ مہاراجہ پر کھتا تو چاہیے کہ اس آدمی کے پاس یہ کین ہے بھی یا نہیں۔ راجہ نے اس کی پرکھیا کے لیے کیا کیا کر خزانے کا مال چوری کیا اور دور جا کے ایک تکیا میں ڈھو دیا۔ دوسرے دن شوروں کا کر خزانے میں چوری ہو گئی۔ بدھ صیبتی نے کہا کہ چوری کا پتا گاؤ۔ بدھ صیبتی نے یہ صیبت پتہ پاؤں کے نشان دیکھے اور تکیا سے مال برآمد کر لیا۔

راجہ نے کہا کہ تو نے چور کا پتا نہ بتایا۔ بدھ صیبتی نے کہا کہ مہاراجا مال لے گیا۔ چور کا پتا چھ کہے کیا کر دے گا۔ راجہ نہ مانا۔ کہا کہ پتا بتا۔ بدھ صیبتی نے کہا کہ ہے راجہ میں ایک کہانی سنا ہوں تو بدھ صیبتی ہے۔ جان لے گا کہ اس کا ارتھ کیا ہے۔ ایک نرنگا رنگا میں افشان کرتے ہوئے ڈوبنے لگا۔ اس کی بھار دوانے نے یہ دیکھا تو چلائی کہ سواہی تم تو ڈوب رہے ہو۔ مجھے ہانسی بھا کے کوئی دھن سکھا دو کہ میرے پاس کچھ کچھ آ جائے اور جہاں سے ہمد میں پیٹ پال سکوں نرنگا رنگا کہاں کھاتے ہوئے ہوا کہ ادنی بھاگوں بھری میں ہانسی کیا بھاگوں اور کیا دھن سناؤں۔ پانی جو خیر صوفو کو طراوت دیتا ہے۔ اور مری مٹی میں جان ڈالو ہے مجھے بار بار ہے پھر اس نے ایک کا تھا چڑھی کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو میرا پان اپنا تھا وہی میرا جان لیا انت کیا۔

بدھ صیبتی نے یہ سنا کہ کہا کہ مہاراجا 'راجہ بھی پر جا کے لیے پانی تان ہے اگر پان ہاری جان لیا ان جانے تو پر جا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی پر اسے چکن نہ آیا۔ بولا کہ مڑ کہانی ابھی تھی۔ پر میں تجھ سے چور کی پوچھتا ہوں وہ بتا۔

بدھ صیبتی نے کہا کہ مہاراجا جو میں کہتا ہوں وہ کان لگا کے سنو۔ اور پھر انہوں نے یہ کہانی سنائی کہ بتاؤں میں ایک کہہ رہا ہوتا تھا۔ روز گرتے گل کر چنگل جاتا اور اپنے برتن بھانڈوں کے لیے مٹی کھود کے لاتا۔ ایک ہی استھان سے مٹی کھودتے کھودتے ایک گنڈھائی کا تھا ایک دن اس گنڈھ میں اتار کے مٹی کھود رہا تھا کہ غمی چل پڑی اور وہاں پر سے ایک توہو اس پر گر پڑا۔ بے چارے کا

سر جھٹ گیا۔ وہ چلا یاور پر گیا تھا بڑھی کہ جس دھرتی سے کوئل بھرتی ہے اور جو کو چکا ہوتا ہے اسی دھرتی کی مجھے کھل ڈال۔ جو میرا پانی پار تھا وہی میرا جان لیوا بن گیا۔ اور پھر بد مصیبت ہی نے کہا کہ مہاراج راجہ پر جا کے لیے دھرتی تان ہے۔ وہ پر جا کو پاٹا ہے۔ پر راجہ پر جا کو سونے گھٹا پر جا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی اور کہا کہ کہانی میری بات کا جواب نہیں تو پھر پکڑ اور میرے سامنے لا۔ بد مصیبت ہی نے کہا مہاراج اسی بڑاس کے ٹکر میں ایک جتا تھا۔ ایک پار وہ بہت بھات کھا گیا۔ اس کی ایسی دو شاہوئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چلا تھا اور کہتا تھا کہ جس بھات سے ان گت بد برسوں کو سکتی تھی ہے اسی بھات سے میری سکت جھین لی اور ہے مہاراج راجہ بھی پر جا کے لیے بھات تان ہے وہ اس کی بھوک دور کرتا ہے اور سکت دیتا ہے۔ پر اگر راجہ پر جا کا بھات جھین لے تو پر جا کہاں جائے۔

راجہ نے یہ کہانی بھی ایک کان کنی اور دوسرے کان اڑائی۔ کہا کہ مگر مجھے کہاںوں پمت ٹرھا۔ چرکا پتا تھا۔ بد مصیبت ہی بولے "مہاراج حالہ پڑا پک چلا تھا۔ اس میں بہت سی ٹھنیاں تھیں۔ ان ٹھنیوں میں بہت سی چڑیاں بسیرا کرتی تھیں۔ ایک پار دوسری ٹھنیوں نے ایک دوسرے سے گر کر کہانی اور ان سے چنگار پیاں نکلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر ایک چڑیا چلائی کہ ٹھنیاں سے اڑ جاؤ کہ جس ترور نے ہمیں شران دی تھی۔ وہی اب ہمیں جلانے پر تھکا ہے۔ جو تھکا را پان پار تھا۔ وہ تھکا جان لیوا بن گیا۔ اور ہے مہاراج جس پر کارول چڑیاں کو شران دیتا ہے اسی پر تھکا راجہ پر جا کو شران دیتا ہے۔ پر اگر شران دینے والا ہی چرچن جائے تو چڑیاں کہاں جا سکیں۔

وہ دوسرا تھکا را جس پہنچي کچھ نہ بھلا۔ وہی سرمے کی ایک ٹانگ کہ چرکا کام تھا۔ بد مصیبت ہی نے پارے کہا کہ کچھ صاحب پر جا کو اکھا کرو۔ پھر میں چرکا کام بتاؤں گا۔ راجہ نے ڈوڑھی بڑا کے ساری پر جا کو اکھا کر لیا۔ تب بد مصیبت ہی نے اونچی آواز سے کہا کہ ہے بڑاس ٹھکر کے ہاسیک لگا کے سنو اور دھیان دو۔ جس دھرتی میں تم نے اپنا دھمن دیا تھا وہی دھرتی نے تمہارا دھمن مٹا لیا۔

لوگ یہ سن کر بے چین ہو گئے۔ انہوں نے تاز لیا کہ بد مصیبت ہی نے کیا کہو اور راجہ پر جا پر مل پڑے۔ پھر اسے ہٹا کر بد مصیبت کی کوراج سٹھا کن چٹھا یاور ان کی بے بولی۔

یہ سننے سننے سندھو اور گوپال دونوں نے اتنا دے تھا گت کی ہے بولی۔ وہ یا ساگر نے دونوں کو دیکھا یہ جانے کے لیے کہ ان میں چھینے کی چیٹک ابھی تک ہے یا جاتی رہی۔ پھر کہا کہ "بھٹو بتانے والا میں تمہیں سب کچھ بتا کے پر لوگ کو سدھارا ہے سو اب کسی سے مت چھو اور اب اپنا دیا آپ جو کوئی تابھ نے سدھارتے سے آند سے کہی کہا تھا۔"

سندھو اور گوپال دونوں تھا گت کے سدھارنے کا دھیان کر کے دھکی ہوئے اور بولے کہ "جس دینے نے جگہ میں جوت

جگہ کی تھی اور میں ڈگر دکھائی تھی۔ وہ دیا بھگ گیا۔ اب سرفی میں اندھکار ہے ہم اپنے دیوں کے دھندلے جانوں میں جھگے ہیں۔ اندھیری چل رہی ہے اور اندھکار بڑھتا جا رہا ہے اور ہمارے ٹھٹھاتے دیوں کی لوندی ہوتی چلی جا رہی ہے۔" وہ یا ساگر نے انہیں ٹوکا اور کہا کہ "ستھو امی تابھ کے لیے کیسی بات دھیان میں لاتے ہو۔ دو تو دھرتی ہیں وہ کیسے بھگ سکے ہیں۔"

یہ سن کر سندھو اور گوپال دونوں اپنی چوک پر بچتے تھے ایک شردھا کے ساتھ امی تابھ کو دھیان میں لاتے اور دھرتی سے اندھیک انہوں نے ایک اہلا پھیلا دیکھا۔ ان کی دھیک کا بچنے لگی اور انھوں میں آنسو اڑنے آئے۔ وہ یا ساگر کے سٹک کی رخیوں نے پراقتنا کی کہ ہم بھٹو گت امی تابھ کی پراقتنا کر رہے ہیں جو دھیان میں پاس کرتے ہیں ہر سے ان پر گندہ بھات پرستے ہیں۔ ہے آقا روپنی ہے ہمارے شاکیہ مٹنی ہے وہ یا کے ساگر ہے امی تابھ۔ ہم تم کو سلطان کے ساتھ ہاتے ہیں تم ہمارے استخان میں آ کے پاس کر اور ہمارے اندھکارت چکاؤ۔"

پھر وہ چپ ہو گئے پر آنسوؤں کی نگاہ رینک بھتی رہی۔ پھر انہوں نے ان دونوں کو یاد کیا جب امی تابھ ان کے سچ موجود تھے اور ٹھکر ڈگر ڈگر کیا بھتی کیا جنگل سب جگہ اہلا پھیلا تھا۔ وہ یا ساگر بولا "ان دنوں ہم امی تابھ کے سٹک رات رات بھر پلے تھے۔ اندھیری راتوں میں گھنے جوں سے گزرتے تھے پر کبھی مجھے نہیں لگا کہ اندھیرے میں چل رہا ہوں۔ ڈگر ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے چرٹائی کا چاند لگا ہوا۔" وہ بولے پھر مل چے جاؤ کہ پاری دھرتی اور سارا اندھیرا جا رہا ہے اور امی تابھ کی ہے دھنی کرتا ہے۔"

گوپال سننے سننے ان دنوں کو دھیان میں لایا۔ کہنے لگا۔ "ستھان دنوں ہم کتا پلے تھے۔ ندان چنے ہی رچے تھے کبھی جنگوں میں کبھی پھیل میں انوں میں اور کبھی ٹھکرا پڑے ٹھکر کر گئی تھی۔"

سندھو رکھ سے تروت آتی تھی آگیا دکھ سے بولا "اب بھٹو اس نے چلنا چھوڑ دیا۔ ان کے پاؤں ٹھک گئے ہیں شریر بھیل گئے ہیں اور جو ہمیں بھول گئی ہیں۔"

اس پر وہ یا ساگر نے کہا "بندھو تھا گت نے کہا تھا کہ جو جوت بہت کھا کھا کے سوتا ہو گیا ہے اور بہت سوتا ہے وہ جگہ پھر میں پھنسا رہے گا۔ سڑ کے تھان پار پار پھینکا گا پار پار مرے گا۔"

سندھو نے کہا "بے کہانی وہ بہت کھاتے ہیں اور کھات چوتے ہیں اور گدوں پر سوتے ہیں اور چاری سے فیس کے بولنے ہیں۔"

”ہاری سے فس کے بولتے ہیں؟“ وہ یاساگر نے ڈری آواز میں کہا۔

”ہاں پر بھونڈیوں سے فس کے بولتے ہیں اور میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ خود سگ کے بھٹکوں کی ناریاں سگ کے بات کرتی ہیں اور کھانچا جھن پستی ہیں۔“

وہ یاساگر نے آنکھیں موند لیں اور دکھ کی آواز میں بڑبڑایا۔ ”بہ تھا کہ تیرے بھٹکوتھ سے بھر گئے ہیں میں اس بھوساگر میں اکیلا ہوں۔“

سندھو راہ کو پال نے بھی آنکھیں موند لیں اور گڑگڑایا۔ ”بہ تھا کہ ہم اکیلے ہیں اور دکھ کی اور تار سے ارد گرد بھوساگر امنڈ رہا ہے۔“

وہ آنکھیں موند مے چپڑے رہے۔ پھر سندھو نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ ”گو پال تو نے یہ دھیان کیا کہ ہم آج پوری پستی میں بھرے ہیں۔“ میں بھٹکا میں سب کچھ ڈا پر کچھ نہیں ملی۔“

گو پال نے اس میں ہاں ملائی۔ ”تو نے جی کہا۔ کچھ میں کسی گھر سے نہیں ملی۔ اور کچھ تو اب بھی کسی ہی دیکھنے میں آتی ہے۔“ سندھو نے سوال اٹھایا ”میں پوچھتا ہوں کھربا میں کیوں نہیں مکتی۔ کیا لوگ تھا کہ کو بھول گئے ہیں یا میں نے دودھ دینا کم کر دیا ہے۔“

گو پال جیسے دونوں کو یاد کر کے کہنے لگا ”ان دونوں سب نر ہاری تھا کہ کے نام کی مالا پہنتے تھے اور تیروں کے قہن دودھ بھرے رہتے تھے اور گھروں میں کھراتی مکتی تھی کہ گھربا ہر والے ہی بھر کے کھاتے تھے پھر بھی جی رشتی تھی۔“

”اور ہم کتنا سوا لے کر کچھ کھاتے تھے۔“ سندھو کے من میں پانی بھرا آیا۔

وہ یاساگر نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”سوا؟ سوا؟ سوا؟ کیا تو سوا لے کر بھونچ کر رہا ہے۔“

”نہیں پر بھو“ سندھو نے عجیب کر کہا ”میں نے بھونچ بھی سوا لے کے نہیں کھا یا سوا ابھی دھیان کر کے کھا یا کہ مٹی میں مٹی ملی رہی ہے اور اپنی بھر رہا ہوں۔ پر جب کھیر آتی تھی تو میرے دھیان میں وہ کھیر آ جاتی تھی۔ جو سجاتے تھا کہ کھلائی تھی اور میرے تالو اور جھڑ کو بھونچنے لگتا تھا۔“

وہ یاساگر نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”بندھو“ بھولے حواں کو یاد مت کر۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھرا اندر جوں کے پھیلے جاں میں بھنچ جاؤ۔“

دونوں نے کان پکڑے اور کہا ”پر بھونچ سوا کو تاک چکے ہیں۔ اس تھا کہ کے دھیان میں سوا لینے ہیں۔“

پھر ایک بار شاکیہ مت ان کے دھیان میں بھر گئے جو اٹھتے جیسے بھٹکوں کو اپنی دھن کے سوا را سوار ہے اور سوا را کے سوا را کو کھاتے ہیں۔ گو پال بولا ”سندھو را جھے دو گھڑی یاد ہے۔ جب تھا کہ نے جھے ہاری سوا را کے جاں لے کھلا تھا۔“

”ہاری سوا را کے جاں لے؟“ سندھو نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

”ارے سوا را کو بھول گیا۔ مجھے وہ سے آج تک یاد ہے۔ تھا کہ آنکھیں موند سے پر شانت موتی بنے بیٹھے تھے اور ہم پر ہم اور شرماتے انکس تک رہے تھے ہم نے دیکھا ان کے ہونٹ تک مسکائے۔ آئندہ نے پوچھا کہ ہے تھا کہ مسکائے کا کارن کیا ہوا۔ بولے کہ اس سے ایک بھٹکا ہاری سے مقابلہ ہے۔“

”مقابلہ میں کون جیتے گا؟“ آئندہ نے پوچھا۔

”مقابلہ کرا ہے“ تھا کہ بولے ”ہاری چار ہے۔ کچھ کھتی ہے اور بھل کے کھل جاتی ہے۔ ایک دکھائی ہے اور چمپا پستی ہے۔ جھلکی چمپا کی جھک دکھائی ہے پھر اوت کر لیتی ہے۔ ابنگا اتار۔ نکتے ہے پھر چڑھا پستی ہے۔“

سندھو را دھیان سے سوا را پا۔ اسے اس جتنی گھڑی کی ایسے یاد آئی جیسے سندھو را منڈ کے آتا ہے ہوا۔

”گو پال تو نے کب کی بات یاد دلائی۔“ ہاں مقابلہ ملت تھا کیا ہاری تھی، تو کنول کا پھول میں پہلے اس پستی میں جاتا تو کھی کھی بھارت اور کیا زمین کیا دھواں پر چوکت پہ جا کے بھٹکا لیتا۔ پر اس کی سندھو را نے مجھے ایسا صہت کیا کہ سب رستے بھولا۔ اس ہی چوکت کا ہوا رہا۔ روز بھٹکا پاتر لے اس دور سے جاتا اور آواز لگا تا کہ سندھو را بھٹو لے۔ اس جھلکی نے مجھ پہ بہت دیا کی اور بہت بھٹکا دی۔ میں نے بہت سوا را لے اور ایک دن تو اتنی دیالوئی کر میں نے جاتا کہ گنگا نہالوں گا۔ اندر جا کے سائل لگالی اور گو میں پھول کے تان آ پڑی ہے گو پال مت پوچھ کہ کسی کوئل مرل گات تھی۔ کہہ دیتا ایسا تھا اور کیسے بھرے کو بے تھے اور پیٹ بالکل غلائی۔ ایک سے ایک ملنے کا تھا کہ تھا کہ کی موتی پر کاشت ہوئی۔“ سندھو را غصہ اس اس لے کر چپ ہو گیا۔

پھر کیا ہوا؟ ”گو پال نے پوچھا۔

سندھو را نے عری سی آواز میں کہا۔ پھر کیا ہوا تھا۔ میں نے اسنا کو مارا اور بیٹھی تھی سے پہلے کھل آ یا۔“

سندھو را نے چپ ہو کر آنکھیں بند کر لیں جیسے دور کے دھیان میں کوکھ ہو۔ پھر آنکھیں کھولیں دھیر سے سے بولا۔ اب وہ کہاں ہوگی۔“

"کون؟" گوپال نے اچھے سے اسے دیکھا۔

"وہی سدری"

"کون جانے کہاں ہو۔"

سندرہ اور کچھ کھڑا ہوا۔ گوپال نے ایک اچھے کے ساتھ دیکھ کر اس کے قدم ہستی کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ گوپال پکارا "بندھو پلٹ آ۔" سندرہ رکھو یا کھو یا چلا گیا۔ گوپال نے زور سے آواز دی۔ "بندھو پلٹ آ۔" وہ دیا سا گر شک آواز میں بولا۔ "سندرہ اب پلٹ کے نہیں آئے گا کہ وہ اب ہمارے جنگل میں ہے۔" گوپال چلا گیا۔ "ہے وہ دیا سا گر! یہ جتن کرو ہمارے جنگل سے نکلنا اور پلٹ آئے۔" وہ دیا سا گر نے اسی شک آواز میں کہا "ہے گوپال تو اسے بھول جا۔ اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ تو بھالے۔" "پر بھو میری چننا مت کر میں بچا ہوا ہوں۔"

وہ دیا سا گر نے اس پر کھنکھنایا۔ "چپ رہا۔ پھر زبردستی غصی جیسا اور بولا۔" جڑیاں سب سے بڑا دیل بول رہا تھا وہ سب سے پہلے گیا۔ ہمارے ایسے بھالے گئی جیسے ہمارے ہاتھ سوتے گاؤں کو بھالے جاتی ہے۔" گوپال وہ دیا سا گر کا منہ جھٹکے گا۔ پھر بولا۔ "ہے گئی کیانی بولنے میں کیا برائی ہے۔"

وہ دیا سا گر کہنے لگا۔ "بندھو جی تو نے زیادہ بولنے والے کی جانک نہیں سنی۔ اچھا تو سن ہمارے بد۔ جی مہاراج ایک ایک بار ایک اور ہادی کے گھر جئے تھے۔ بڑے ہو کر راج کے ستر کی سنے مگر وہ راج بہت بڑا تھا۔ بدھو جی نے سن میں وہ چار کہا کہ کسی پر کار راج پر جتا جاتا ہے کہ راجہ کی بیٹی زیادہ بولنے نہیں نہ زیادہ سننے میں ہے۔"

اب سنو کہ حال پہاڑ کی کئی میں ایک کئی تھی۔ وہاں ایک کھوار تھا۔ وہ مرغان بھی اڑتی وہاں آئیں۔ تینوں میں گاڑی پھینے لگی۔ ہر ایک سے ایسا آواز نکلتا کہانی سونگے گا۔ مرغان میں نے کھوسے سے کہا کہ ستر حال پہاڑ میں ہمارا گھر ہے وہاں بہت پانی ہے تو ہمارے سنگ مل وہاں بھٹن سے گزرے گی۔

کھوا ہوا کہ "ستر میں بھرتی پر دیکھنے والا جانوڑا اچھی اونچائی پر کیسے پہنچوں گا۔"

مرغان میں نے کہا کہ "اگر تو یہ وہ جتن دے کہ تو زبان نہیں کھولے گا تو سبھی تھے وہاں لے ملیں گے۔"

کھوسے نے چپ رہنے کا وہن دیا۔ مرغان میں نے ایک انڈی لاکھ کھوسے کے سامنے رکھی اور کہا کہ کلچ میں سے اپنے

دانتوں سے پکڑا اور کچھ بولنا مس۔ پھر ایک مرغانی نے اپنی چونک سے انڈی کا ایک سرا اور دوسری نے اپنی چونک سے دوسرا سرا پکڑا اور اڑا لے۔ اڑتے اڑتے جب وہ ایک گھر سے گزرے تو ہاتھوں نے یہ قاشا دیکھا اور شور مچایا۔ کھوسے کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا تھا کہ اگر میرے ستروں نے مجھے سہارا دیا ہے تو تم کیوں گل مرے۔ مگر اس نے یہ کہنے کے لیے کھو کھوئی جی جی کی کپ سے زمین پر گر پڑا۔

اب سنو کہ یہ کھوا جہاں گرا تھا وہ جگہ راج کے گل میں تھی۔ گل میں شور مچا کہ ایک کھوا وہاں میں اڑتے اڑتے زمین پر گر پڑا ہے۔ راجہ بدھو جی کی شکست میں اس جگہ آیا۔ کھوسے کی دورشا دیکھ کر بدھو جی سے پوچھا "ہے بدھو جی تو کھتا کہ کھوسے کہ یہ گت کیسے تھی"

بدھو جی نے تر تہ کہا "یہ بہت بولنے کا پھل ہے" اور کھوسے اور مرغان میں کی پوری کہانی سنائی پھر کہا کہ "ہے جو بہت بولتے ہیں ان کی بھی رات گت جاتی ہے۔"

راجہ نے بدھو جی کی بات پر جی جی میں وہ چار کیا۔ بات اس کے جی کو تھی۔ اس دن کے بعد سے یہ ہوا کہ وہ کمر تھا اور زیادہ تھا۔

یہ جانک سا کہ وہ دیا سا گر نے کہا کہ "بندھو ہم بھٹو لوگ کھوسے ہیں اور سننے میں ہیں۔ جو سوچ ہے سوچ بولنے کا وہ گر پڑے گا اور وہ جاتے جاتے دیکھا کہ سندرہ کس بری طرح گرا اور بولا۔"

گوپال کے جی میں یہ بات اڑ گئی۔ بولا کہ "کچھ بھٹو ابھی راتے میں تھے کہ گر پڑے اور وہ گئے۔" پھر کہا "اب میں چپ رہوں گا۔"

اور گوپال کچھ چپ ہو گیا۔ کیوں وہاں کرتا کھٹکا لینے ہستی جاتا اور کسی سے بات کے بنا دیکھ آ جاتا۔ ہر ایک دن اس ہستی کے کلچ اس کے گھر ہادی اور بھین کے ستر پر بھاگنے سے آواز پکڑا کہ کہ "ہے ستر میں میرے لیے راج کا سندرہ لایا ہوں۔ سن کہ میرا چار لوگ سندرہ اب رات گدی خالی پڑی ہے۔ میری سہا جیے جاتی ہے اور میری سندرہ ستری سولہ سنگھار کے میری بات دیکھتی ہے۔"

گوپال نے کہا کہ "ہے ستر یہ سندرہ دکھ کا استکان ہے۔ رات پات سوہ کا جال ہے۔ ہاتا چا ستری مانا کا کھیل ہیں۔ ہم بھٹو تھاگت کے ہاتھ ہیں۔"

بس مگنی ہے اور اس نے جانا کہ اسے دستو کیان مل رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ آتم کیان اپنی جگہ گرد آوی کہ دستو کیان بھی ملنا چاہیے۔

دستو کیان میں نمن اور آتم سے ہر صبح دو دو ذکر چلتا رہا دیکھتا رہا۔ سترہ یا چھترہ یا سو گھنٹہ رہا۔ اسی چلنے پھرنے میں اسے ایک جگہ دکھائی دیا۔ "ارے یہ تو اہلی کا کل ہے۔" وہ صلف کیا اسے اچھٹا ہوا کہ اس نے کتنے دنوں سے اس جگہ میں پاس کر رکھا ہے مگر اسے پتہ ہی نہ تھا کہ اہلی کا کل بھی ہے۔ پھر اسے یہ دھیان کر کے اچھٹا ہوا کہ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے کتنے جگہوں کی چھان بین کی ہے مگر ابھی اہلی کا کل دکھائی نہ آیا۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا کیا ان دنوں میں اہلی کا کل ہوتا ہی نہیں اور یہ سوچتے سوچتے اس کا دھیان پیچھے کی طرف کیا۔ اہلی کا کل اچھا کلا تھا۔ کان کی سان لہی لہی کنار میں تیری اتاری طوطوں کی ڈار میں۔ جازوں کی رت میں ہر صبح طوطوں کی لمبی لمبی ڈار میں شور کرتی آتم اور اس جگہ پر آتم میں۔ میں نے اس کے بعد بہت دن دیکھے پھر اپنا ہوا ہر صبح نہیں دیکھا اور ابھی کسی جگہ پر اسے خوب طوطے اترتے نہیں دیکھے اور پھر اس جگہ کے ساتھ اسے خود اتھوڑا کر کے بہت کچھ یاد آیا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے اونچے نیچے میں اُٹے رہتے۔ ان پر دوڑتی گرد آؤاتی تھیں جہاں جگہوں پر دوڑتی گھبریاں کر گئی تھیں اس کا جتنی لے کر گھبرئی کے پیچھے بھاگتا گھبرئی کا ایک کر کل پر چڑھتا نہیں پا جا کر دو ٹھنی ٹھنی جانکوں سے کھڑے ہو کر اسے دیکھتا اور پھر جوتوں میں چھپ جاتا۔ کسی بہت میں سے دو سوئیں بھی زبان کے ساتھ ایک لال لال منہ کا ہانک دکھائی دیتا اور ارجھل ہوتا جاتا اور اس کے سارے بدن میں ڈر کی ایک لہر کا سرسراہٹ اور پس کو ٹھنسی۔ اسی جگہ سے شام کے کھینچنے میں وہ اس سے قلمی قلمی ایسے جیسے ہندی ساگر سے ملتی ہے۔ پہلے ہوتے ملے پھر وہ اہلی کی طرح کی گچھی لمبی باہن اس کے گردن کے گرد لگیں اور ان کی آن میں وہ دو سوئیں شام کے کھینچنے سے رات کے اندر سے میں چلے گئے۔ یہ دھیان کر تے کرتے اس کے اندر ایک مناس گھٹتی چلی گئی باہنوں نے سوہم میں بیٹا ہوا دستو گیان "اس نے سن ہی میں میں کہا اور ایک آتم میں ڈوب گیا۔

اس دستو میں وہ کچھ دیر رہا۔ پھر پچھل ہو گیا اور اس نے سوچا کہ سب جھٹکوں کی چھان بین سے نکل کر جھٹوں کے نیچے چلے گئے اور کٹھنوں پر سونے گئے اور چاروں سے آنکھ خا کر ہنس کر نے گئے اور وہ آکھلا بن میں بھٹکا پھر رہا ہے۔ سب پلٹ کر اپنے اپنے استقامتوں پر چلے گئے۔ میں کیوں اپنے جگہ سے دور ہوں۔ جگہ کی یاد اس کے لیے جلاوا دینی تھی۔ اس کے پاؤں اس کو گر پڑ لے جہاں بھگل سے نکل کر اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

جگل سے نکلنے لگتے وہ ایک دم خشکا ایک پرستہ سورتی اس کے دھیان کا رت کا رت دی تھی۔ اور وہ اپنے پیش سے وہ بھول ہی گیا تھا کہ ہے کھٹو اپنے چاروں کی دیو جہاں رکھو اور اگر قربانی کے لئے پڑ جاؤ تو اپنے آپ کو وہاں سے ایسے نکالو جیسے اچھی دلدل

یہ کہہ کر گوپال مڑ گیا۔ پھر ہار چیکے سے پکارا۔ "اتر میں نے تیری بات سنی۔ پھر بھی میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں دن اس ہستی میں رہوں گا اور اسی استقامت پر اپنے کے تیری بات دیکھوں گا۔"

گوپال واپس ہونے کو ہوا گیا بہت بڑا جگل تھا پھر بھاری آواز رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ وہاں ساگر کے پاس آ کے ایسے بیٹھا جیسے جگہ سے پتا کرتا ہے۔ بولا کہ "جے کیانی میں چپ ہوں پھر بھی گرد ہا ہوں۔ ڈنڈی میرے راتوں سے نکل پڑ رہی ہے تاکہ میں کیا کروں۔"

وہاں ساگر نے کہا "پھول کو کچھ۔"

گوپال پاس کی ایک پھولوں کی چھاڑی کے سامنے آسن مار کر جھٹا اور ایک پھول کو مارا بھی اچھی کھٹا کھٹنے لگا۔ کھٹا رہا۔ پھول مسکا تا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے رنگ سے رنگ ہوا اور پھول مرجھا گیا۔ گوپال کو جیسے کل آگئی ہو۔ اپنے آپ سے کہا کہ جے گوپال سنسار سار سے اور آٹھیں بند کر لیں۔ پر جب پھر بیٹھے اس نے آٹھیں کھولیں تو اسی قسم کی ایک پھول کھٹا ہوا تھا اور اسے دیکھ دیکھ مسکا رہا تھا۔ کھلے پھول کو دیکھ وہ جگل ہو گیا۔ اس کی درشتی بکھری۔ آٹھیں دھرا دھرا بھٹکتے لگیں اور اسے یاد آیا کہ آج تیسرا دن ہے۔ وہ خوب کراٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے پاؤں آپ ہی آپ ہستی کی طرف اٹھنے لگے۔

وہاں ساگر سے جاتے دیکھا گیا اور چپ رہا۔ جب وہ آٹھوں سے ابھل ہو گیا تو وہ ہر بھری قلمی جہا۔ پھر اسے تھا گت کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ باتر میں اگر سو جہو جہو وہاں کھلی ساقی تھے تو کھٹائی اسی میں ہے کہ باتر ی اکیلا اپنے جگل میں چلے جاتی تھی۔

۱۴۰

تھا گت کی یہ بات یاد کر کے اسے بہت ڈھارس ہوئی۔ اس نے اس پر دھاڑ کیا اور اسے اس میں بہت کجیر جتا دکھائی دی۔ میں نے تھا گت سے پہلے سنا اور اب جانا کہ جڑا دیو سرک کے ساتھ چلتا ہے اور سنے میں بہت دکھا دکھاتا ہے۔ سور کو کی گت سے یہ چھٹا ہے کہ دیو اکیلا رہے اور اکیلا چلے اور اس نے یاد کیا کہ سندھ اور گوپال کی گت نے اس کے گیان میں کتنی کثرت ڈالی ہے وہ بڑے ہی درجے تھے اور اس کا دھیان بار بار بہت جاتا تھا اسے لگا کہ کتنے منوں کا جو جہو جہاں کے چلے جانے سے اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ہٹا ہٹا جاتا اور بہت ہو کر بھگل میں کھٹے لگا دیکھی اونی اونی کھٹا کھٹا کے چلے گا۔ کبھی کبھار پر پڑ لیا۔ کبھی کسی اونی ڈر پے ہوا۔ اس کے ذہل ڈال پات پات کو دیکھا۔ پھولوں کو کھٹاتے اور ٹہنوں کو کھڑاتے دیکھا۔ ہندی کنار سے چلنے ہوئے فیکس دھارا کا شور مٹا۔ اسے لگ رہا تھا کہ سارا سنسار آٹھ گیت سے بھر گیا ہے اور پھولوں کی کھٹو جمل قتل میں رنج

سے لگا ہے۔ اس نے آگے اٹھنے ہوئے پاؤں کو رکھ دیا اور اپنے چپے ہاتھی دلدل سے لگا ہے۔

وہ ایک بچکتا دے کے ساتھ چلتا کرتا یا اور ایک قبیل کے چلنے والے ان مار کر تیر گیا وہ بچکتا یا یہ سوچ کر کہ وہ بچکتے چلوں اور اپنی ندی کو کچھ کرکٹوں ہوا تھا۔ کیا تھا گت سے نہیں کہا تھا کہ بچکتو ڈھنسا سکا اس کا دن اور خوشی کس بات کی کہ سنا تو دھو دھو چل رہا ہے اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ اس نے جانا کہ یہ سنسارا گن کٹہ ہے۔ ہر چیز چل رہی ہے۔ پھول پھٹے چلنے والی ندی اور اس کی اپنی روشنی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ دونوں جہاز مارے آنکھیں موندنے محم بیٹا رہا۔ پر اسے شافی نہیں ملی۔ اس کا دھیان بار بار بھٹکا اور اسی کے چلنے کی طرف چلے جاتا۔ زراش ہو کر وہ اٹھ اور شافی کے کونٹ میں ایک لمبی پتھر کی۔

ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں دوسرے جنگل سے تیسرے جنگل میں چلتے چلتے اس کے کھوے خولم خون ہو گئے اور پاؤں سو جھگے اور ناخوش دیکھنے لگیں۔ آخر کو وہ اردو لو کے جنگل میں جا نکلا۔ وہ کچا کچا کر کے بڑی درم کے پاس گیا۔ اس اپنے گھنے برگہ کو دیکھا جو ایک دیوتا جان چڑوں کے کچے کھڑا تھا۔ وہ اس چلنے کے چپے جہاز مار کے بیٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر پختی کی کہ بے شاہ کی مٹی ہے تھا گت ہے اسی تا یوز یہ بچکتو حیرانگہوا ہے اور ستے میں ہے۔ آنکھیں موندیں اور بڑا پایا۔ "شافی شافی شافی۔"

بیٹا رہا بیٹا رہا۔ دن بیتتے چلے گئے اور وہ پھر بتا بیٹا رہا۔ پھر ہوا ہوا کہ دھڑ سے دھڑ سے شوک اس کے مٹی سے دھل گیا۔ من میں آنند کی ایک کوئیل پھوٹی اور دھیان میں ایک ہرا بھرا بھرا بھرا۔ وہ چل دھلی کا چل تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جانا کہ اس نے بھی پایا ہے۔ لمبی کہ ہر زراش کی کا پانا جنگل اور پانا چل ہوتا ہے۔ دوسرے جنگل میں دھوونڈنے والے کو کچھ نہیں شے گا۔ چاہے وہاں بڑی درم ہی کیوں نہ ہو۔ جو شے گا اپنے جنگل میں اپنے چلنے کی چھاؤں میں شے گا۔

یہ بھی پا کر وہ یا ساگر نے جانا کہ اس نے میان کی ڈالی پالی۔ اور چلے اپنے چلنے کی اور ہر اردو لو کے جنگل سے نکلے نکلے ایک جھاوا نے اس کے سر پر چڑھ لیے۔ وہ یا ساگر نے تو نے بھی پایا ہے یا چھے مارنے بیکار ہے۔ وہ ایک دھماچہ میں چڑ گیا کہ ڈنڈی اس کے دانتوں میں ہے یا دانتوں سے پھٹ گئی ہے۔ اس دھماچہ میں اس کا ایک پاؤں اردو لو کے جنگل میں تھا اور دوسرا پاؤں اپنے چلنے کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ان کٹہ میں چاٹوں اور آگ دیکر رہی تھی۔



پتے

انگلے وہ بھراہی گل میں تھا اور اسی دور سے کہ نکھٹا پایا۔ پھر وہی کوئل جہاز والی ڈنڈی پائی اور بھراس نے چنگی نظروں کے ساتھ نکھٹا پتہ آ کر گردے پایا اور نکھٹا لے کے چلا گیا۔ یہی اس کا ختم تھا کتنی ڈنڈیوں سے کتنی زراشوں کے ہاتھوں سے اس نے نکھٹا کی تھی مگر کبھی نظروں کے کسی کو نہیں دیکھا اس نے جان لیا تھا کہ کچھ اندر یہ مٹی آگھ سب سے زیادہ پانی ہے۔ جو رکھائی دیتا ہے وہ سب مایا کا جال ہے۔ دیکھنے والا مایا کے جال میں پھنستا ہے اور رکھاتا ہے سو آگھ دکھ دیتی ہے۔ سومت دیکھو اور مت پھنسا اور مت دکھ اٹھا۔ سو وہ نہیں دیکھتا تھا کہ نکھٹا کس ہاتھ سے چل رہی ہے۔ سو اس نے یہاں بھی نہیں دیکھا کہ نکھٹا دیتے والی کون ہے کیسی اس کی صورت ہے بس اپنے کوئل جہاز کی کتنی نظروں کے سامنے چلے بھر کے لئے آتے اور اوٹھ جاتے۔ وہ اس ڈنڈی پر ایک دن آ یا وہ دن آ یا اور آ جا چلا گیا کہ نکھٹا اس ڈنڈی سے بہت شرمناک تھا کہ ساتھ چلی تھی۔

وہ ہنست چلی کا دن تھا۔ گلی گلی دور سے دور سے پہلی ساڑھیاں بھراہی تھیں۔ مانوسوں کھیتوں میں نہیں لگیں میں چھوٹی ہے اور گیندا کیا رہیوں میں نہیں ڈنڈیوں میں جکا ہے۔ اس نے آن بھراہی دور سے جا کے ساٹھل بجائی اور بھراہی جہاز والی ڈنڈی پر آئی۔ پر آن جہازوں میں مہندی لگی تھی۔ اس نے کتنی نظروں سے ان جہازوں کو دیکھا اور چھپا کیا کہ گور سے جہازوں میں مہندی کیسی رہتی ہے اور وہ کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اچھے سے مہندی رہے گور سے کوئل جہازوں کو نکھٹے لگا۔ یہ دھیان ہی نہ رہا کہ اسے نکھٹا بھی لینی ہے۔

"بچکتو اسی اہل دی کہ دھواں کا دن ہے۔" اور اس آواز کے ساتھ کہ یہ آواز آئی اس نے کھلی باز کی تھی۔ نکھٹا پتہ کے ساتھ اس کی نظروں بھی اٹھ گئیں اور بھراہی ہی رہ گئیں۔ کیا سوچی صورت تھی کہ چند ماہیا پال کھٹا سے آنکھیں سرگ کی سی۔ گردن سواری کی سی۔ چھاتیان ڈھانچا تیاں گات بھری بھری کر پتل پتل سا ڈھی ہنسنی تھے پال بند۔ وہ سدھ دھ کوئے نکھٹے پاندھ اسے نکھٹے لگا۔ وہ ندی کی ایک بڑا پانی کہ بھوتوں سے بھری تھا ہاتھ سے گر پڑی۔

نیلے اس شہد ان خالی پتہ کے ساتھ اپنے دستاں پر وہاں آ یا۔ من کو ایک چٹا لک کی تھی۔ کیا مجھے سوہ نے آن بھراہی ہے۔ بہت

وہاں کیا کچھ مجھ میں نہ یا جیسے اس کی مست ماری گئی ہو۔ آئندہ کے پاس پہنچا اور بولا کہ "پرہیز میں کیا کل ہوں۔"

آئندہ نے اسے دیکھا جیسے ٹوہر ہوا۔ "کارن؟"

"ناری"

"ناری؟"

"ہاں ناری! اور سچے نے اپنی ساری چٹا کر رکھی۔"

آئندہ جیسے کے ساتھ آنکھیں کھولنے کی چٹا سٹار ہا۔ پھر اس نے آنکھیں موندھ لیں آنکھیں موندھ سے چپ بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور بولا "بندھو گیاں اور راجڑھیاں سوہ کا چال ہیں۔ ہیکشورن کا نیم یہ ہے کہ وہ گھوٹوں میں رکے جس اور راجڑھیاں میں ٹھہرائیں کرتے۔ گلی گلی دروازے دروازے پھرتے ہیں ہیکشورن آج پاس سے کل وہاں سے۔ پر مورو کھوتے اس نیم کا پان نہیں کیا تو نے وہی کیا جو سندھو نے کیا تھا۔"

"سندھو نے کیا کیا تھا؟"

"تو نہیں جانتا سندھو نے کیا کیا تھا؟"

"نہیں پرہیز نہیں جانتا کہ سندھو نے کیا کیا تھا۔"

جب آئندہ نے سچے کو سندھو کی کہانی سنا۔



سندھو کی کہانی

جنم افطی کا دن تھا۔ سہانی رات محل سے بھاڑوں کی دم بھم ہو رہی تھی۔ ایک حویلی میں ایک بڑھاڑھیا وھارواں وھارو رہے تھے۔ ایک بچہ اچھر سے گزری تو اس نے اچھٹا کیا ہے۔ دیکھا تو دم پر کا چٹا چڑی ہے کہ آج جنم افطی کے دن جب ہر ناری بوڑھا ہا لک اسب مانتا ہے تم آٹھ سوں کی گنگا جتا ہا ہے ہو۔"

وہ دھکے سے بولے۔ "اری تارے نے شاب جنم افطی ہے نہ بولی دج اہلی ہے پات کے پھلنے کا روگ ایسا لگا ہے کہ ہر گھڑی اسے یاد کرتے ہیں اور دوتے ہیں۔"

"پات پھلنے کیا؟"

"اری تارے ایک ہی تو پت تھا وہ ہم سے پھلنے کیا اور ناری دینا اندھیر کر گیا۔"

"کیسے پھلنے کیا؟"

"ایک دن بدھ دج کا اس گھر سے گزرا ہوا۔ ان کے اچھٹا نے اسے ایسا بولا کہ کہاں تو چھپا بنا پھرتا تھا اور کہاں یہ کہ سر مٹا یا پھلا پاتا پھتا اور شاکیہ مٹی کے پیچھے ہو گیا۔"

"اس پات کا نام کیا ہے؟"

"سندھو"

"اچھا میں تمہارے پات کو دیکھ لاناؤں گی۔"

"اری تو کیسی بات کرتی ہے۔ شاکیہ مٹی کے ٹکڑے میں جا کے کون دانہں آئے؟"

بچہ نے تارے دکھایا۔ بولی "وہ اپنے سے کاٹنی ہے تو میں بھی اپنے سے کی بچتی ہوں۔"

یہ کہہ وہ پاس سے چلی۔ شاکیہ مٹی کا پاتا چلا کیا کان دنوں کہاں براجتے ہیں اور کس گھر میں ان کے ٹکڑے بکھلا لینے چکے ہیں۔ اسی گھر پہنچی ایک اونچی حویلی لے وہاں رہ چکی۔ سندھو ہر روز بکھلا پاترے ہستی میں پہنچتا کبھی اس گلی میں کبھی اس گلی میں۔ ایک روز

اس گل میں آیا اور اس اونچی اونچی کی ڈیڑھی پہ پہنچا۔ دو تہن تو بات ہی دیکھ رہی تھی۔ قہار نے کے خود ڈیڑھی پہ پائی۔ ایسی چڑائی سے بات کی اور ہلکھلا دی کہ سندھو نے اگلے دن پھر اس کی کا پھیر لگا یا اور اس ڈیڑھی پہ پائی۔ پھر وہ اس ڈیڑھی سے ایسا بڑا کہ دوا سے دوا سے جانا چھوڑا روز اس ڈیڑھی پہ جا کھڑا ہوتا اور ہلکھا پتر بھردا کے لوتکا ایک دن چڑائی سے کہنے لگی کہ ”جکھوٹی“ جہار سے ہم میں کوئی فرق نہ پڑے تو آج نہیں پہ حارہ اور بھونجی کرو۔ میں جانوں گی کہ میری کنیا کو چار چاند لگ گئے۔“

سندھو نے دھار کیا۔ پھر دل میں کہا کہ تھاگت نے بھی کسی کو نہیں کیا۔ ایک سو رکھ نے ان کے سامنے بھونجی کے نام ہاں کے رکھ دیا۔ اس پہ بھی نہیں کیا اور ہاں لکھ لیا۔ گھسے کی نئی اٹھائی چاہیے۔ سو سندھو نے اس دن اس ڈیڑھی میں جگہ کے بھونجی کیا۔ اس تہن نے دوسرے دن بھی سبکی اچھا کی اور سندھو نے پھر اس کی اچھا بانی لی۔ بس سندھو روزی اس ڈیڑھی میں جگہ کے بھونجی کرنے لگا۔

سندھو کو اپنی ڈیڑھی پہ چاہ لینے کے بعد اس تہن نے گل کے ہاتھوں کو بھلا یا پھسلا یا کہ جب جکھوٹی ڈیڑھی میں جگہ کے بھونجی کرین تو تم گل میں خوب دکھانا اور دھول مٹی اڑانا میں دکھاوے کے لئے ڈانٹوں ڈانٹوں کی۔ تم بالکل مت مانگا۔ اگلے دن ان ہاتھوں نے سبکی کیا۔ تہن نے ہاتھوں کو ڈانٹا پتا مگر انہوں نے ایک کان بنی اور دوسرے کان اڑا دی۔ اگلے دن کچھ سندھو کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی ”کہا کہ“ پھر بھونجی گل کے ہاتھ جگت ہیں۔ گروٹی اڑا کے بھونجی کو خراب کرتے ہیں۔ میں سختی کرتی ہوں کہ آپ اندر آ کے چہ چہ رہیں اور بھونجی کریں۔“

سندھو نے پھر یہ دیکھ لیا کہ ڈانٹا اور کچھ کی بات چپ چاپ مان لی۔ اس دن سندھو ڈیڑھی سے نکل اندر دکان میں جگہ کے بھونجی کرنے لگا۔ دو بھونجی کرتا اور کچھ اس کی سیر کرتی۔ سیر کرتے کرتے چھپ دکھاتی۔ کیا اس کچھ کی چھپ جی اور کیا روپ تھا۔ صورت سرخ سفید جیسے سب اٹار چھلپاتا کن جسٹ بھونجی کان ہی کول گداری چھپا جس کو بے بھرے سندھو جب اس کی اور دیکھتا تو اس کا ذوق نہ لگتا۔

تھاگت نے اپنے گلیاں سے جانا کہ ان کا ایک جکھوٹ کرگت میں ہے۔ ان دنوں تھاگت نے اپنے ہارے عکھ کے سنگ سرواتی کے برابر اتھ چکا کہ باغ میں ہاں کیا تھا۔ سب تنگی اپنی پیش منے کے لئے اکٹھے ہوئے تھاگت ایک کچھ آج سے جو ان مار کر پیٹے اور آٹھیں سوٹ لیں جکھویر بعد آٹھیں کوٹیں سنگیوں کو کھا پھر ان کی گلیاں بھری نغریں سندھو پر آئے خیر نہیں کھل جاندہ کے ساتھ کچھ رہے۔ پھر بولے ”سنگی“ ”جیراں کن کاران اچاٹ ہے؟“

سندھو نے سر ہلکا لیا اور کھڑکے بولا ”ہے تھاگت“ سو کے کاران۔“

تھاگت گھنگلی ہانڈے سے دیکھا کہ۔ پھر بولے ”جکھوٹا سو میں دکھ ہے کامنا آدلی کی دروشا کرتی ہے کامی آدمیوں سے وہ بندر کھلے پنہلوں نے یہ جید جان کر گروہ میں باندھا اور رکھ پایا۔“

جکھوٹوں نے پوچھا ”ہے تھاگت“ اوہ کھلے بندر کن تھے اور کہاں تھے؟

”کیا تم نے کھلے بندروں کی کہانی نہیں سنی؟“

کھلے بندروں کی جانک

بیس برس ہوئے منٹش جاتی سے وہ پرے ہال کی حلقی میں بندروں کی برادری رہتی ہے۔ ایک پار ایسا ہوا کہ کوئی ظہاری ابھرا نکلا۔ اس نے ایک بندر کو جتن کر کے پکڑا اور بیس جا کے راجہ کو دے دیا۔ اس بندر نے راجہ کی ایسی چاکری کی کہ اس نے پرن ہو کے اسے آزاد کر دیا۔

وہ بندر لوٹ کے اپنے بھلے ہاتھوں پر برادری اس کے گرد انکھی ہو گئی سب پوچھنے لگے کہ ”بندھو تو اسے دنوں کہاں رہا؟“

”بندھو؟ میں منٹش جاتی کے بچہ رہا۔“

”منٹش جاتی کے بچہ؟“ اچھا؟ پھر بتا کہ تو نے اس جاتی کو کیا پایا؟

”بندھو آپ مت پوچھو۔“

”ہاتھ پوچھیں گے۔“

”اچھا یہ بات ہے تو سنو کہ منٹش جاتی میں بھی زیادہ وہ تھے جیسے ہمارے بچے ہوتے ہیں پر ان میں نہ کی ضروری پہ لیے لیے ہاں ہوتے ہیں اور زیادہ کی چھاپاں بڑی بڑی ہوتی ہیں آج بڑی کی کھل کھل کرتی ہیں۔ کھل کھل چھاپوں والی ضروری پہ ہاں والوں کو وہ میں پھنساتی ہے اور دکھا دیتی ہے۔“

بندروں نے کانوں میں اٹھایاں دے لیں چلائے ”بندھو بس کریم نے بہت سن لیا۔“

پھر وہ اس نیچے سے یہ کہہ کے اٹھ گئے کہ کم نے ہاں جگہ کے برائی کی بات سنی ہے۔ اب ہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔

تھاگت یہ جانک سنا کے چپ ہوئے پھر بولے ”جکھوٹا سنا نے والا بندر میں تھا سننے والے بندر وہ تھے جو آج میرے جکھو

ہیں۔“

ایک ہنگشتہ نے اچھی سے پوچھا کہ "تو تھا گت تیری مراد کو کیسے دکھا دیتی ہے جب کہ مرد دلوان ہے اور دوتزل ہے؟"

تھا گت سکا نے "ہوئے ہنگشتہ تیری تزل ہے تو کیا ہوا۔ چار جہوئی۔ اپنی چڑائی سے ملنا انوں کے مل نکال دیتی ہے کیا تم نے چار را بھکاری کی جانک نہیں تھی؟"

"نہیں تھا گت۔"

"تو سن۔"

چار را بھکاری کی جانک

پچھلے کی بات ہے کہ بازار میں ایک راہرہ تھا جس نے ہنگشتہ جاکے دو یا حاصل کی بہت دھماں بہت دھماں اس کے ایک بڑی تھی۔ یہ سوئی کہ بڑی غراب نہ ہو جائے وہ اس پر بہت کڑی نظر رکھتا تھا۔ پر تیری کوسات تالوں میں بھی رکھتو وہ غراب ہو کے دیتی ہے۔ راہرہ نے بہت چوکی کی گھر راج تکاری کے نین ایک دسیا سے لڑ گئے۔

نین تو لڑ گئے پر ہنگشتہ کی صورت کھنکھاتی تھی کہ اس میں چوکی کی بہت بہت تھا۔ رسیا نے دایہ کو اپنا بیوی بنا لیا اور گل میں بیٹھا۔ دایہ گل میں چا کر را بھکاری کی چا کر بن گئی۔ ساتھ ہی تاک میں رہی کہ موقع ملے تو را بھکاری سے بیوی کی بات کی جائے۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ بھی را بھکاری کے سر میں جو میں دیکھ رہی تھی۔ جو اس کو کر پڑے کہ یہ تے اس نے ناخن سے سر کو کھینچا۔ را بھکاری بھی اڑتی چڑا کو کچڑی تھی۔ بھاپ لیا کہ دل میں کیا کھلا ہے۔ "ہائی" اسی منہ سے بھوت کس نے کہا کیا ہے۔"

دایہ نے حوصلہ بکرا لیا "تو چھتا ہے کیسے ملوں؟"

ہوئی "یہ کوئی بات ہے سدا ہوا تھی کالی گنا نرم کھائی۔"

دایہ نے را بھکاری کا کہنا سنا۔ رسیا بھی کھینچا کھینچا تھا۔ سب اشارے بکھڑا گیا۔ ایک اچھی کوسدا ہوا ایک نرم سے لڑ کے کو ملا۔ جب سدا ان کے دن آئے اور کالی گنا میں گھر کر آئیں تو رات بڑے اچھی پر ہنگشتہ کے کڑے کو ساتھ بٹھا لگی اور تے جا پہنچا۔ اصر را بھکاری نے راہرہ سے کہا کہ مہاراج کیسی سندور دشا ہو رہی ہے۔ میں تو اس درشا میں ایشان کروں گی۔

راہرہ نے بہت بھلا یا پر وہ نہائی۔ ایشان کے لئے چند میں لگی اور اس مندر پر پر جا پہنچی جس کے برابر رسیا اچھی پر سوار بیٹھا تھا۔ راہرہ نے یہاں بھی چوکی کی اس کے پیچھے پیچھے بیٹھ گیا۔ جب وہ کپڑے اتارنے لگی تو اس نے منہ پھیر کر پر را بھکاری کی کھائی کو کپڑے را۔ را بھکاری بھی ہلا کی بنی ہوئی تھی اس نے اٹھ کیا کھولے کے کھانے کھائی راہرہ کے ہاتھ سے چڑائی بھر کھڑی بھر بعد لا کے

کی کھائی راہرہ کے ہاتھ میں کپڑا دی اور دوتزل پر سے پڑنے کی بھر یہ جاوہا۔

انہو میرے میں راہرہ کو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہو گیا۔ اور بھر میں بھی اس نے منہ پھیر رکھا تھا۔ اس کی طرح منہ پھیرنے کھائی کپڑے واپس ہوا۔ را بھکاری کی تازی میں اسے دیکھ لیا آگے سے ساگل لگا دی۔ جب صبح ہوئی جب پتہ چلا کہ را بھکاری تو رسیا کے ساتھ بھاگ گئی۔ راہرہ نے ہار کے کہا کہ "تاری کی چوکی ٹھمن کام ہے۔ کھائی کپڑا تو کو بھی مل دے جاتی ہے۔"

تھا گت جانک ستانے کے بعد چپ ہوئے بھر ہوئے "ہنگشتہ! جانتے ہو وہ راہرہ کون تھا وہ راہرہ میں تھا کہ کھینچنے نظم میں راج گدی پر بیٹھا تھا اور ایک میری بڑی تھی۔" چپ ہوئے بھر کھڑا سا اس بھر کے ہوئے "میں نے پرا کرتی کے بیہ جانے پر تازی کے بیہ بھاگ دیکھا جانتے۔"

سندور جیسے سوتے میں جاگ اٹھا۔ تازی کے بھار کو جاتا اور اس بھر سے ہنگشتہ کی لٹائی۔ من میں کہا کہ آج میں اس تازی سے کہہ دوں گا کہ گل سے میری بات نہ دیکھے۔ یہ پر گیا کر کے وہ اس راہرہ پر پہنچا۔ ہنگشتہ نے رازی طرح اس کی آؤ بھکتی کی اور اندر لے جا کر دلان میں بٹھا یا پر آج اس کے کھلائے ہوئے ہانگوں نے راہرہ کی کے اندر آ کے دھما چو کڑی شروع کر دی۔ اس رازی نے پہلے تو ہانگوں کو ڈانٹا پھٹکا را بھر جب وہ نہ مانے تو سندور سے کہا کہ "ہنگشتہ تھی یا اس نے ہانگ رول کاتے ہیں اور جن میں ستاتے ہیں۔ اچھا ہو کہ اوپر کوٹھے چال کے کھنکھ کر۔"

سندور یہ سن کر پہلے تو لا۔ پھر سوچا کہ لوگ مان لیں ان کی اچھا باری کرنی چاہیے یہی بدھ تھی ہے اور میں بھی آج اس گھر میں میرا آخری بھوجن ہے گل میں کہاں اور یہ گھر کہاں ہیں یہ سوچ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے آگے کھنکھ پیچھے وہ۔ وہ بیڑیاں چڑھتا چلا گیا۔ اپنے بیڑیوں پر نظریں جمائے ایک ایک بیڑی چڑھ رہا تھا۔ اس نے کہاں یہ دھماں دیا کہ اس کے کون گل را ہے کھڑا آگے جانے والی کی بارک کے کھڑی ہو گئی جیسے وہ تھک چکی ہو اور ہر بار سندور ہے دھماں میں ایک نرم نرم سامنے کے ساتھ چھڑا گیا۔

بیڑیاں چڑھ کے کھنکھ نے سندور کو ایک کی بنی اثر یا میں لے جانے کے نرم بیچ پھلا دیا۔ بھر آپ بھی برابر میں یہ کہہ کے ہر گئی کہ بیڑیاں چڑھ کے میں تو تھک چکی اور اسے سرے بندھو تازی کے پاس سر کو پھلانے کے چاہیے گریں۔ وہ کھنکھ ان چالیسوں گروں میں بیڑی ہوئی تھی اس نے پہلے تو ایک کی اگڑائی لی۔ اگڑائی لیتے ہوئے باہر کی کھنکھیں اور اٹھا میں بھر شرما کے سکا کے کر دین بھر ناخن سے ناخن کھر پتی تھی۔ بھرا انوں میں ساڑھی کا کپڑا دبا کے لپائی بلا کی کارن کے زور سے فسی بھر ایک دم سے ہاتھوں

کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں اور اس استخوان کو چھوڑ دیا تھا جہاں انہوں نے یہ بات سنی تھی۔ مجھے بھی یہ غر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ مگر سے حد موڑ کے جنگل کی اور ہوں۔

گھیاں ڈیوڑھیوں ناریاں سب چھپے ہوئی تھیں۔ سنبے اچھے رنگوں میں چل رہا تھا پلٹے پلٹے اس نے پھولے ہوئے ایک اشوک کے پلے کو دیکھا اور رک گیا۔ اس پلے کے نیچے اس نے زرخیز ہنس کیا بدست رت تھی۔ سرسوں پھولی ہوئی تھی گیند امک رہا تھا۔ اشوک کی ڈالیاں اپنے ہی بوہ سے جھکی ہوئی تھیں۔ سنبے یہاں دیکھ کر بہت پرہیزگارانہ لگا دیکھا کیا۔ پھر وہ اچھٹے سے من ہی من میں کھینکے گا کہ ہر رام کس کس نے اس اشوک کو کھڑک ماری ہے کہ وہ اٹھا پھولا ہے۔ بس اس وچارے کا تھوڑا سا کامیاب مہندی والے اہل کل ہوں گی اور چلا گیا۔ کیا اس اشوک کو ان مہندی والے اہل کل ہوں گے اس نے فکرمندی ہی ہے وہ مہندی ہی بہت سا ماضی میں لپٹی اس کے دھیان میں ابھری۔ تھوڑی دیر تک وہ اس دھیان میں ایسے ڈوب رہا کہ کسی بات کی سادہ جھسی نہ رہی مگر پھر اچانک وہ چلا۔ یہ تو میں پھر مود کے پھندے میں پھنس رہا ہوں۔ وہ رت وہاں سے اٹھ کھڑا ہوں۔ اس پلے کے برائی کی بات میرے دھیان میں آئی ہے مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔

سنبے نے پھر ایک لمبی پتڑا کی اور جنگل جنگل مارا پھرا۔ دن گزرے مہینے بیتے ریش چھیں اور آخری۔ ہر اپنی چٹک جھک کے ساتھ آئی اور بیت گئی۔ ہر رت سنبے کو دھکی کر کے گئی۔ کبھی پھولی سرسوں کبھی پورے آتم کی بھی ڈالنا بھگتنا جھنڈا کبھی منڈ لاتی بھینجی کبھی دھکی کر لکڑی کی پکاڑ کبھی اس اور کی جھکاڑ کبھی چھپا کی مہکاڑ کبھی چٹکی کی ہنس تو جوں کہ ہر رت آئی اور پڑاؤں کی شانیت غری میں ملکر سے پیدا کر جاتی رہا۔ یہاں سے جٹا مل ٹوٹ کے آ جاتا اور وہ سندر صورت سامنے آ کھڑے ہوتی۔ سنبے سوچ میں پڑ گیا کہ یہاں بھی سب رتے اسی دواری اور جاتے ہیں بہت وچارے بعد اس نے یہ حق لاکا کر دیش پٹے اندری سے ملی ہوئی ہیں اور پٹے اندری دکھ کے پاؤں دوڑا رہے ہیں۔ آدمی سو دیش کس کس راو سے پھنسا ہے کبھی کوئی کل بھنچو چھو کے کبھی کوئی رت پانی سن کئے پھر کبھی کوئی تھک اسے لے لڑتی ہے کبھی رنگ اسے لے ڈوبتا ہے۔ سو بات جوں ہے کہ ہر رت دکھ دیتی ہے۔ یہ جان کر وہ اس ہوا اور کبھی ہو کے کہا کہ اگر مگر یہاں ہیں اور جنگل میں دیش ہیں میں مود کے جال سے کیسے نکلوں۔

سنبے انہیں وچاروں میں تھا کہ پت بھڑکا گئی۔ دن اس ہو گے۔ ڈال ڈال سو کئے پتے بکھرنے لگے۔ ہوا کے ہر جھوکے کے ساتھ ان سخت پتے ٹھنڈوں سے گرتے اور جہاں جہاں تھرتھرا ہوا جاتے اب یہ رت جھ سے کیا کہنے آئی ہے۔ سنبے پھر سوچ میں پڑ گیا۔ دھیرے دھیرے پھر اس کے اندر کمن ہوئی۔ اسے پھر کچھ یاد آئے گا تھا۔ پر اب کے ایک یاد دہی طرح کی آئی کبھی رت تھی اور

میں چند چھپا لیا۔ آپ زور زور سے بولی۔ پھر ایسے ہولے ہولے بولی جیسے کان چھو کر ہی ہو۔ پہلے دور سٹ کے جنگلی پھر دو سوا بھرا کے چند گئی چھاتوں سے پلے ڈھلکا گیا پھر ادا پر سر کا لیا۔ راتوں سے ساڑھی سر کا لی پھر جلدی سے نیچے کر لی اور ایک بار تو ایسی انگڑائی لی کہ ہنڈا کپ۔ پھر وہ جلدی سے سٹ گئی ایک بار بوٹ بوٹوں کے پاس لے آئی۔ پر پھر شرما کے کہا کہ پیچھے ہٹ گئی۔ اور اسے مرے بندھو سندھو تو بالکل موہت ہو گیا بھولا کہ وہ جھکٹو ہے اور وہ تو پہلے ہی سے گرہائی ہوئی تھی۔ اسے گرا، تادیکھ کے کل کھلی ہے جیسے ناچنے دان پکائی دھیر، ہنڈے دی اور نہ اس کے تن پر تار نہ پڑا۔ سید سے سید راتوں سے راتیں بھرنے لگی تھیں۔

آند چپ ہو گیا۔ سنبے تڑپ کے بولا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوا؟" آند بھنا۔ "تھا کہ جہاں پاندھے آتھیں سوندھے پٹے تھے انہیں خوب دکھائی دے رہا تھا کہ باغ سے دور شراوتی کی اس اونچی چوٹی کی اوڑیا میں ڈار ایک بکھٹو کے ساتھ کیا چھل فریب کر رہی ہے پٹے کی فوبت گئی تھی۔ جان بس گٹھ ہونے لگے تھے کاسی تابو نے اس اوڑیا میں اپنا درس دکھایا۔ سندر سندر کی سری سادہ اہل آئی۔ بس کام مادی میں ڈوبے ڈوبے پتے پھر نکل آئے۔"

آند کھائی سا کہ چپ ہو گیا۔ دھیرے دھیرے وچاروں میں ڈوب رہا تھا۔ پھر غلط اسانس بھرا اور کہا کہ وہ کیا مشکل سے تھا کہ تھا گت ہمارے پٹے براہی تھے۔ کوئی آکائی تار کے چھل میں آ جاتا تو وہ اسے جوتی دکھاتے اور سنی پتے پلے آتے۔ "چپ ہوا پھر بولا" مجھے تار کے چھل سے کون بچائے گا۔"

آند بولا "ہے سنبے سنبے جوہی سدی کہتا ہوں جہاں تابو نے مجھ سے کہا تھا کہ آند تو اب آپ اپنا دھپ بن۔"

سنبے نے یہ سن کر وچار کیا پھر کہا کہ سنبے آپ اپنا دھپ بنوں گا۔ سو دھیرے دن جب وہ بکھٹا پاترے کے پستی کی اور چلا تو پر کھٹیا کی کہ وہ اس گل میں نہیں جانے گا پر جب وہ پستی میں داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا کہ ہر رات اسی گل کی اور جاد رہا ہے جس رتے چھٹا لگا کہ وہ رت اسے اسی گل میں اسی ڈیڑھی میں لے جا رہا ہے۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ پھیل ہوئی شراوتی آج اتنی سٹ گئی تھی۔ اس غم کی ایک ایک گل کی اس کی کھنڈی ہوئی تھی۔ ہر گل کی ہر ڈیڑھی سے وہ بکھٹا لے چکا تھا غم نے جس گل میں ڈیڑھی کا اس نے دھیان کیا کہ وہاں وہ ہاتھ میں تھاں اس کی بات دیکھتی ہے وہ ایک بار پھر سے مگر کو دھیان میں لایا۔ پھر اس نے اچھا کیا کہ کتنی گھیاں ہیں کہ جال کے تھان پھیل ہوئی ہیں اور گل کی کتنی ڈیڑھیاں ہیں کہ ہر ڈیڑھی میں کوئی تار ہی بکھٹا دینے کے لئے کھڑی ہے۔ گھیاں ڈیڑھیاں تار یاں اس نے سوچا کہ یہ سب پایا کا جال ہے پھر وہ ان کھٹے بندروں کو دھیان میں لایا جنہوں نے تار کی بات سن کے

ایسی جنگل تھا۔ تخت گت سے بچ پت جھڑی اس کے پاس کیا تھا۔ ارد گرد پتے پتے سگے پتے بکھرے پڑے تھے۔ ہاتھ بڑھا کے
 ہاتھ سے ٹھکی بھری پلٹا کر اندر کود دیکھا۔ "آند کیا سب پتے میری ٹھکی آگئے ہیں؟"

آند بھبکا پھر بولا "تھا گت یہ ت پت جھڑی ہے پتے جنگل میں اسنے جھڑے ہیں۔ کران کی گنتی نہیں ہو سکتی۔"

تھا گت سے کہا "آند تو بے لک کا کہا۔ پت جھڑے ان گت ہاتھوں میں سے بس ایک ٹھکی اٹھا سکا ہوں۔ بس گت کھانچوں کی ہے
 جتنی کھانچا بس میری ٹھکی میں آئیں میں نے ان کا ہر پار کیا۔ ہر کھانچا ان گت ہیں۔ پت جھڑے کے ہاتھوں کے سامنے۔"

اس یاد سے اس پر نرالا جاؤ کیا کہ وہ جہاں کاتھان کھڑا ہو گیا۔ ہمارے قدم آگے بڑھا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہیں ایک گتہ قہل
 کی چھاؤں میں آسن مارے کھڑے کیا اور گتے ہاتھوں کو کھڑا ہاتھ اور دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے کر کے اس کی آنکھیں بند کر چلی گئیں
 جو باہر ہے وہی میرے اندر بھی ہے آسن مارے آنکھیں بند کرے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا جانے کتنے دن کتنے جگہ۔ جب اس نے
 آنکھیں کھولیں تو جانا کہ ان گتہ رشتیں یہ ت گئی ہیں اور اب وہ پت جھڑی ہے۔ اس کی گود میں زرد سو گے پتے بکھرے تھے۔ وہ
 زرد سو گے ہاتھوں میں نہایا ہوا تھا اور صوب میں حب رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے اوپر دیکھا۔ جس قہل کو گنا دیکھ کے وہ اس کے
 چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ اس قہل کا ایک ایک پت جھڑی کا تھا پھر اس نے ارد گرد نظر ڈالی اور دیکھ کر حیرتی کوزر ہاتھوں سے ڈھکا پلایا۔ اور
 تک چل کر اندر کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے شانت من میں بھلا لکھ۔ میری کامتا میں گئی زرد سو گے ہاتھوں کے سامنے جھڑی
 ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ بسنت رت، رکھا رت، ہارے کی رت، سب رتیں آئی جاتی ہیں۔ پھل جھڑ جاتے ہیں ہاں اڑ جاتی ہے
 نہیں سو کہ جاتی ہیں۔ ہر پت جھڑی ہے۔ وہ سکا پت جھڑی اس کی ٹھکی بھرنی ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ شانت تھا۔ من میں کہا کہ
 میری یاد اس حد ہوئی۔ اب مجھے داپھیں چلنا چاہیے۔

سنبے جنگل میں خالی پات جاکل من کے ساتھ گیا۔ جنگل سے بھری ٹھکی اور شانت ہر دے کے تک لوٹا جنگل سے نکل آیا تھا۔ اب
 وہ بھری ہستی میں تھا۔ شراوتی میں اس سے کسی چمک تک نہ تھی۔ لگتا تھا کہ گر نہیں پھلا پھولا ناغ ہے۔ رنگ اور سادگی کی نئی امندی
 ہوئی تھی چمکے چمکے چمکے کھار یاں، سندرہاریاں، رنگ رنگ کی ان کی ساز صیاناں گھٹوں میں آجیاں جاتیاں۔ اس نے ایک ہر اک کے
 ساتھ یہ سب بکھو دیکھا۔ ایک بار میں ہی آئی کہ ہستی کے بچ کھڑا ہو کے چمکاؤنی دے کہ ہے آگیا نیغ ہے شراوتی کے پاس اور رنگ رس
 میں مت ڈوب پھول کھلا جاتے ہیں۔ ہو پاس اڑ جاتی ہے رنگ روپ اتر جاتا ہے جو نر ازل جاتا ہے۔ سندرہ کی سب رتیں آئی جاتی

ہیں۔

پت جھڑی امر رت ہے۔ ہر من میں تو ہر اک رتی کیا تھا۔ بولنے کو اب ہی کب پاتا تھا۔ گم سم آنکھیں جھکا کے شراوتی کی گتوں
 سے گزرا۔ آنکھ اٹھا کے یہ بھی نہ دیکھا کہ کس گلی میں ہوا اور کس دوار سے نکلتا، گتے ہو۔ کیوں دیکھیں۔ مطلب تو نکلتا ہے ہے۔
 ہر رانی کو اس سے کیا کہ کس دوار سے ملا ہے اور کن ہاتھوں سے ملا ہے جنگی نظروں سے بس دینے والی کے ہاتھوں کو دیکھا اور جہاں وہ
 گئیں۔ بالکل ویسے ہی گور سے ہندی گئے تھے۔ کیا یہ وہ پت جھڑی کے نظر اٹھائی۔ کیا دیکھا کہ وہی کھڑی ہے بالکل اسی بر میں ہستی
 ساز میں لٹھے پتال بند ہی ہاتھوں میں بھونچن سے بھری تال۔ ٹھکی نظریں ٹھکی کی ٹھکی رو گئیں۔ قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ نہ کوئی
 قدم آگے۔ ایک پل میں جگہ یہ ت گئے۔ لگا کہ بزم خیم سے وہ اس راجہ دھڑی پانی گت سے کھڑی ہے اور بزم خیم سے وہ اسی طرح صوفی کا
 ہوا سے نکلا رہا ہے۔

من اس کا پھر دیکھ لیا تھا اور آگیا پھر دیکھتی تھی۔ رت جھڑی لے لے گئی تھی۔ اندر منڈیلاؤں میں کوئلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے ایک
 دوسرے کے ساتھ اپنے اندر جھٹکا "کیا میرے ہمسر ہمار کوئی کوئلیں پھوٹ پڑی ہے اور اس نے اچھے کے ساتھ سو چا کہ اپنے دل پہ
 کے کھالے میں پلٹے پلٹے میں کہاں آگیا ہوں اور یہ کیسے پتے ہیں کہ میری ٹھکی میں آگئے ہیں۔



واپس

سو ہے غصہ! اب بدھ یو جی نے آنکھیں کھلیں اور کہا کہ ”بے شکشود یہ پہلی بار نہیں ہوا۔ ایسا آگے بھی ہو چکا ہے۔“ بھکشو یہ سن کے سوچ میں پڑ گئے۔ پوچھا کہ ”یہ تھا گت ایسا پہلے ہو ا تھا۔“

جب بدھ یو جی نے ایک جانک ستائی جہاں پر کار ہے کہ بنارس کے سدر گھر کے باہر ایک مرگھت تھا جہاں بہت سے کتے روجے تھے۔ ان میں ایک کتا ان سب کا گر دھا۔ سب کتے اس گر کا بہت آدر کرتے تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ بنارس کا راجہ اپنے دھرم میں جھگڑے کے سیر کو نکلا۔ دن بھر سیر کرنے کے بعد شام کو لوٹا۔ چاکروں نے دھم کا سلمان باہر پڑا چھوڑ دیا۔ رات کے سے درشا ہوئی تو سارا سلمان بھیگ گیا۔ اس سلمان میں دھم کے گدے بھی تھے جن پہ چلو سندا ہوا تھا۔ یہ پہلا بھیگ گیا۔ رات بھر ان کتوں نے چلو سے کو گپا پا کر راتوں سے کاٹا اور کھا گئے۔

دوسرے دن راجہ تک بات پہنچی کہ کتے دھم کے گدوں کا چھڑا کھا گئے۔ راجہ نے تاف کھانا اور مٹادی کر دی کہ کتے جہاں دکھائی دیں انہیں مار ڈالو۔ بس بھڑکنا تھا بنارس گھری کے کتے مارے جانے لگے۔ یہ سب وہی کتے تھے جو شیشان گھاٹ میں ٹھکانہ کرتے تھے۔ جب مرنے کتنے لگے تو اپنے گرو کے پاس جا کے اپنی چٹا ستائی اور پائی دی کہ ہے گر کہیہ انانے ہے کہ رات بھر ان کے چالی کتے گھر میں زندہ نہ بھرے جیں اور ہم شیشان گھاٹ کے ہاسی بنا کر مارے جاتے ہیں۔ گرو نے یہ بات سن کر رات بھر ان کی راولی۔ راجہ کے شاگردوں نے اسے بہت دھکا دیا مگر ان نے ایک نہ سنی اور سیدھا راجہ کے سامنے پہنچا اور کہا کہ ”یہ منٹل چائی کے راجہ کتوں نے تیرا کیا کیا ہے کہ ان کی جانوں کا بھری ہو گیا ہے۔“

”انہوں نے میری دھم کے گدے کاٹ ڈالے۔ اس کا سارا چھڑو چھا گئے۔ سو میں نے ڈونڈی پڑا دی کہ گھر میں جو کتا دکھائی دے اسے مار ڈالو۔“

”یہ راجہ کیا یہ ہم راج بھل کے کتوں پر بھی لاگو ہوتا ہے؟“

”نہیں وہ میرے شران میں ہیں۔“

”کیسا انانے ہے کہ پرا دی راجہ کے شران میں ہیں۔ نزدیکی مارے جاتے ہیں۔“

”اے کتے اتونے یہ کیسے جانا کہ یہ راج بھل کے کتوں کا کیا دھرا ہے۔“

”مہاراج ہاتھ لگھن کو آری کیا اپنے کتوں کو دودھ میں تھی اور کھاس ملا کے چلاؤ اور پھر تاشا دیکھو۔“

راجہ نے تروت دودھ میں تھی اور کھاس ملوا کے اپنے کتوں کو چلا دیا۔ جو کتا دودھ چٹا اپنا پانی پیتا اور چلو سے کے نکو سے اگل دیتا۔

جب راجہ نے شیشان گھاٹ کے کتوں کو معافی دی۔ راجہ نے کتے کی سکھا کو کر دھ میں بانٹ دھا اور اسے اپنا مستری بنا دیا۔ اور بے شکشود! اس سکھا کا اثر ایک لاکھ برس تک رہا۔ لاکھ برس بعد راجاؤں کے لیکن بھرو یہی ہے ہو گئے جیسے پہلے تھے۔

بدھ یو جی جانک ستاکے چپ ہوئے پھر بولے کہ بے شکشود! وہ کتا میں تھا۔“

”تم؟“ سب بھکشوؤں نے پکارا کے بول چلا۔

”ہاں میں! وہ راجہ تھا! کتوں کا گرو میں تھا۔ شیشان گھاٹ کے دوسرے کتے تم تھے۔“

”ہم؟“

”ہاں! تم! تم نے اپنے کرموں کے کارن آگے چل کے آ دی کا جنم لیا اور پھر تم میرے غصی بنے۔“

”اور رات بھر ان کے کتے؟“

”وہ۔۔۔۔۔۔ وہ ابھی تک کتے ہیں۔“

اگر کسین سے یہ جانک سن کے سب بھکشو اگلے میں پڑ گئے اور رو چار کرنے لگے۔ ویر بعد گو بنہ نے لہٹا کھٹا اسانس لیا اور کہا کہ

”وہ کیا منگل سے تھا کہ ہم شیشان گھاٹ کے کتے تھے اور تھو کہ ہمارے تک تھے۔ ہمارے ہی کارن تو انہوں نے یہ جنم لیا تھا۔“

انہوں نے کہیں جوتی بھائی تھی۔ کہ کتے بھی آ دی بن گئے تھے اور اب کہ ہم آ دی کے جنم میں ہیں۔ آ دی آ دی نہیں رہے ہمارے آ دی دکھائی پڑے ہیں پرا تھو سے۔“

اگر کسین نے بات کائی اور کہا کہ ”حز یہ پہلی بار نہیں ہوا آگے بھی ایسا ہو چکا ہے۔“

”اگر کسین اتونے یہ کیسے جانا کہ آگے بھی ایسا ہو چکا ہے۔“

”حزو میں نے تھا گت سے ایسا ہی سنا ہے۔“ اور اگر کسین نے ایک جانک ستائی کی اسطر ہے۔

یہاں بیٹے کے کی بات ہے جب بنارس کے راج بھکھاسن پر راج چھندہ ابراہیمان تھا اور رات بھر ان میں ہمارے بدھ یو جی کی ابھی

”ہمارے کے شیشاں گھاٹ میں۔“

اگر سین نے اسے گھور کر دیکھا کہا ”مور کے ہم نے لاکہ برس تک جنم جنم کے کثرت کیسے ہیں تب تک لوٹ جیت کے آؤی ہنہ ہیں تو پھر میں ہرے جنم میں لے جاتا چاہتا ہے۔“

”ہم آؤی تو بن گئے پر۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر بھڑک گیا اور اپنا کارڈ بریک ایک بات بھی نہ کی۔ پر اس کے اندر ایک کھلی جی ہوئی تھی۔ وہ وہ کہہ سوتا کہ لاکہ برس بیت گئے ان لاکہ برسوں میں میں نے کتنے جنم لئے اور کتنے کثرت کیسے۔ انت میں آؤی کا جنم لیا۔ پر اس جنم میں پہنچے سوچتے سوچتے ہو گئی ہو گیا۔

جاکل سن اور دکی آقا کے ساتھ وہ دریک آٹھیں موندے تم ہم جیڑا ہا۔ اس سے کے جنم کے دھیان نے اسے بہت دکی اور بیا کل کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا دھیان پچھلے جنموں کی اور گیا۔ دھیرے دھیرے اسے لاکہ لاکہ برس سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں اپنے ان سخت جنموں کے تک دھیان ہی دھیان میں وہ اگلے پاؤں چلنے لگا۔ اس جنم سے پچھلے جنم میں پچھلے جنم سے اور پچھلے جنم میں پھر اور پچھلے جنم میں۔ دھیان ہی دھیان میں اس پہ سارے پچھلے جنم بیت گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ تاروں کے مرگٹ کی طرح ٹپک پکڑا ہے۔ وہ چٹک پڑا۔

گو بند نے آٹھیں کھولیں۔ اور گرد دیکھا۔ سب جگشوا دھیان میں تم ہم بیٹھے تھے اگر سین تیراں مارے آٹھیں موندے دھیان ساگر میں ادا تھا۔ اس آں استہ دنیا بہت اجاز دکھائی دی ہمارے کا ہر شیشاں اپنے باسیں سمیت اس کی آٹھوں میں پھر رہا تھا۔ میں مرگٹ کا ہاں مرگٹ سے دور اس سنار میں ابھی ہوں۔ اس کے اندر ایک لہری لہری اور وہ اپنا کسری پاتا ہونڈھ ٹھکانا پاتر سنبھال اٹھ کر کھڑا ہوا۔

اگر سین نے آٹھیں کھول کے اسے دیکھا۔ ”بندھو کہہ جانے کے دھیان میں ہے؟“

”ہمارے کے مرگٹ کی اور۔“

”ہمارے کے مرگٹ کی اور؟“

”ہاں ہمارے کے مرگٹ کی اور۔“ اور وہ پیچھے دیکھے بتا جلدی جلدی چلا اور ٹھکیوں کی آٹھوں سے ابھلی ہو گیا۔



ہر صیستہ تھے۔ رات کنار کے روپ پر پہنچتے تھے۔ روپ انوپ صیستہ چھوڑ ہاں لکی۔ اس کا رن انکس سب گل کے اندر ہا ہا ہا ہا کھ کہتے تھے۔ بتائے انکس تینوں دیہی بن یاد کر آئیں اور ساری دو یا چھ اڈولی۔ پر ابھی ساتوں برس لگا تھا کہ چند اے پر ان چھوڑے اور رکھکٹ کو سدھارا۔ رات سنگھاس پر اب اہس کھ کو وضنا تھا بہت سے درباریوں کی نیت میں کھٹ آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ رات کنار ہتی پانی ہر کے ہیں رات کنار کے کام کیسے کریں گے۔ درباریوں میں بھلے لوگ بھی تھے وہ کہتے تھے کہ رات کنار نے ساتوں دو یا میں پڑی ہیں پر جا کے جیتے ہیں۔ رات کنار نے کے لئے اور کیا چاہیے۔ کھوئی نیت داہوں نے کہا کہ اچھا یہ بات ہے تو ابھی پر کشا کئے لیتے ہیں۔ دو دو کا دو دو پانی کا پانی ہوا جاتا ہے۔ وہ ایک بندر کوشال دوشالے اڈر حاکم اور دو گلوں پر چلا کر اہس کھ کے سامنے لائے اور کہا کہ ہے رات کنار یہ بہت دور ہوا آؤی ہیں۔ رات کنار یہ میں جہادی بہت سہا کا کریں گے تو انکس اپنے ستری منزل میں لے لو۔ ہر صیستہ جی نے اسے سر سے چٹک دیکھا اور کہا کہ سترہ دیا ہاں میں منہ ہے۔ مجھے آدھیوں کی سہا کا چاہیے جہاں بندر ستری بن جائیں وہاں اس کے سوا کیا ہوگا کہ پر جادگی ہوگی۔ رات چرٹ ہو جائے گا۔

کھوئی نیت والے اپنا سامنہ لے کے چلے گئے۔ پر دوسرے تیسرے دن وہ پھر اسے آدھیوں کے بھس میں پکڑی دھرتی بندھوا کر لائے اور کہا کہ ”ہے رات کنار یہ ہمارے پتا کے رات میں ایک نیا ایک تھا۔ چاروں مرگٹ اس کی نیائے کا چر چا تھا۔ تم ہی اسے نیا ایک بناؤ اور پر جاکر اسے صفحہ ہو جائے۔“

ہر صیستہ جی نے بھنگی پاندھ کے اسے دیکھا ہاڑ گئے کہ یہ آؤی جس بے کر سترہ دیکھی بندر دگی نیا ایک ہوئے ہیں۔

بس اس کے ساتھ کھوئیوں کا پال کل گیا اور ہر صیستہ جی سنگھاس پنیلہ کے رات کنار نے گئے۔ انہوں نے سدھ جہ کے ساتھ رات کنار اور پر جاکر بھلائی کی سکھ دی۔ اس سکھ کا لاکہ برس تک اور ہا۔ لاکہ برس تک لوگوں نے آؤی اور بندر کے سترہ کو پتا دیکھا اور اسن گئے سے ہے۔

اگر سین جاکہ ستا کے چپ ہو گیا۔ دوسرے بھنگو میں کہ دھیان سے جاکہ سن رہے تھے چپ بیٹھ رہے۔ پھر گو بند نے سراٹھایا اور بولا کہ ”ہے اگر سین کیا لاکہ برس پرے ہو چکے ہیں۔“

اگر سین نے جواب دیا کہ ”اکیانی تو دیکھا نہیں کہ دیا کی کیا دشا ہو گئی ہے اور نوگ کیسے سو رہا ہو گئے ہیں۔ پھر بھی تو پوچھتا ہے کہ کیا لاکہ برس پرے ہو گئے ہیں۔“

گو بند بولا ”پر ہاڑ ہم پلٹ نہ پھیں؟“

”کہاں؟“

جیسے ہم اس دوج کو ازل سے چاہتے رہے ہیں اور اب تک چاہتے رہیں گے۔" یہ کہتے کہتے اس نے ڈال کیا۔ پھر اچانک بولا۔ "ہم بھی کسی مال کے پکڑ میں آ گئے ہیں۔ اس نے ہمیں سکے کے بال بدم کرنے پر نہیں لگا دیا۔ دوج اب چاہنے پر لگا دیا۔"

"یہ کہہ رہا ہے۔" یاجون نا جوت کا منہ کھلے گا۔

"میں شک کہہ رہا ہوں یاجون۔ یہ دوج نہیں پکڑ رہا ہے۔"

یاجون سن کر بہت پکڑا۔ اس کا دل بڑھ گیا۔ مگر جب اس نے ایک نظر دوج پر ڈالی تو اسے پتلا اور پی پا کر اس میں پھر سے حوصلہ پیدا ہو گیا۔ "دیکھ یار زگر یہ پکڑ بھی ہے تو آج رات میں ہم اسے قلم کر دیں گے۔ تو دیکھتا نہیں کہ انکی اول رات ہے اور ہم نے دوج اتنی چاہ لی ہے۔"

یاجون اٹھ کھڑا اور دوج اب چاہنے کے لیے مستعد ہوا۔ مگر یاجون بڑا بیضا ہوا۔ بھائی لپٹے ہوئے بولا۔

"یار دوزخ کے پکڑ میں بالکل بور ہو چکا ہوں تو دوج اب کو چاہتے ہیں۔ میں چلا۔"

"تو کہاں جائے گا۔"

"بس کسی الٹے چاہنے والوں کا ہاتھ تاجوں کا اور کہانی سنوں گا۔"

"یار واقعی کتنے دن ہو گئے۔ کہ ہم نہ کسی الٹے چاہنے والے کوئی کہانی سنی۔" ایک دم سے کتنے بولے سرے الٹے یاجون کے تصور زندہ ہو گئے۔ سچ بھی بھئی ہوئی آگ اور دگر چنے ہوئے لوگ ہر سرے کوئی کہانی کوئی بڑا حباب۔ اور درمیان میں بیٹھا ہوا کوئی بزرگ کہ رات کے جاوے کے ساتھ کہانی کا جاوہ چکر رہا ہے۔ "یار تو یہاں بھٹکے کھڑے کھڑے چھوڑ جائے گا۔"

"پکڑ تو بھی ملے۔"

یاجون ڈانٹوں اول ہو گیا۔ اسے ڈانٹوں اول دیکھ کر یاجون نے شہکا۔ "یار چھوڑ اس پکڑ کو۔ جاوے کے الٹے چلتے ہیں اور آخر سے کہانی سننے ہیں کتنے زمانے سے ہم نے اس بزرگ سے کہانی نہیں سنی۔"

یاجون پر یاجون کی بات اثر کر گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا لگا تھا کہ نظر دوج اب پر جا پڑی۔ دوج اب کو دیکھتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ "یار یہ پکڑ اس کل تک کے لیے پختہ نہیں ہو سکتا۔"

"کل کیا ہو جائے گا آج صدمہ ہے۔ وہی کل ہوگی۔"

"نہیں مجھے یقین ہے کہ آج رات میں دوج اب کو ضرور چاہ لائیں گے۔ کل ہم بالکل غارغ ہوں گے۔"

رات

"یار اس پکڑ کے لیے ایک طریقہ یاد کیا۔"

"کیا؟"

"لطیف۔ یا حکایت جو کچھ بھی سمجھو۔ ایک عامل کو اس کا ہزار سو لے نہیں دیتا۔ جب اسے خیرہ جاتی تو ہزار آٹھ دس لے کر دھمکا کر گھسے کام بتاؤ۔ عامل اسے دودھ اور کے کام بتاتا بھی چاہے وہ اس کی طرف بھیجتا بھی پکڑ کی راہ دکھاتا۔ بھی سات ستر پار کی میم پرانہ کرتا۔ ہزار چشم زدن میں وہ کام انجام دیتا اور پھر میں اس وقت جب اس کی آنکھ لگتی آن موجود ہوتا کہ کوئی اور کام بتاؤ۔ عامل اس سے بہت دق تھا۔ آخر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اس کو پکڑنے کے لیے بالوں والے پلوں کے طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس کے بال بدم سے کر۔ ہزار اس کام میں لگ گیا۔ مگر اس کام نے اسے الجھا دیا۔ ہزار بار اس کے بال بدم سے کر تا اور بار بار وہ پکڑ چاہتے۔ بس پھر ہزار رات بھر کتنے کے بال بدم سے کر تا اور عامل اطمینان سے سو رہتا تھا۔"

یاجون نے حکایت سن کر بہت غصہ ہوا۔ دونوں مل کر غصہ پکڑ یاجون کو کچھ خیال آیا۔ کہنے لگا۔ "مگر تو آج چلے ہوئے ایسے پس بول رہے ہیں جیسے میں اس کو کوئی کام نہیں ہے۔ گتا ہے کہ رات میں پس بول کر ہی گزار دیں گے۔"

"یاجون نا جوت بولا۔ "میں کسی بھی بول نہ چاہے کہ میں کم از کم یہ یاد رہے کہ نہ اس کام کے لیے پنی ہے۔"

یاجون کو یاجون کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کہنے لگا۔ "یاجون بولنا کوئی کی کمال کی بات ہے سب ہی لوگ ختمیں خدا نے زبان دی ہے بولتے ہیں مگر ہم بولنے سے بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔"

"بڑا کام تو ہم انجام دے رہے ہیں۔ یاجون بول کر بولا۔ "مگر اس پکڑ میں ہم چھوٹے کام سے بھی گئے۔"

"میرے یا تو ضرور ہر کر۔ جو با نہیں اس دوج اب کو چاہنے کی سکتہ رکھتی ہیں۔ وہ بول بھی سکتی ہیں۔"

"پکڑ میں وہ سن کر آئے گا۔ جب ہم بولنے جو کہ ہوں گے۔ فی الحال تو یہی گتا ہے کہ ہم بیٹھے اسی لیے ہوئے ہیں کہ اس دوج اب کو چاہتے رہیں۔ تاکہ موت آئے اور میں چاہ لے۔ یاجون کا پکڑ بولا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں موت بھی نہیں آنے کی

”پھوڑا رکب سے ہم آج کل آج کل کر رہے ہیں۔ اسی آج کل ہی میں ہم نے عمر کی ترقی سہانی راتیں ضائع کر دیں۔“

”یار جہاں اتنی راتیں ضائع کی ہیں وہاں ایک رات اور سہی آج کی رات اور اس دلجو کو چاٹ کر دیکھتے ہیں۔“

”اچھا اس شرط پر رہتا ہوں کہ بس آج کی رات اور ہم اس درجہ کو چاہیں گے۔ چنے پانے چنے کل کی رات یہاں نہیں لگتی۔“

”ہائی تیری شرط“

چھوٹے ہو جانے کے بعد دونوں سرگرمی سے اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیا اور چھجک گئے۔

رات گئے تک دیوار کو چاٹنے کے بعد دونوں ایک ذرا اس لیے کے لیے کے۔ یاجون نے دیوار کا جڑو لپا تو دیکھا کہ وہ تو بالکل اور حق مٹنی ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا کہ بس اب تو آکھوں گی سوئیاں روگنی ہیں۔ مگر یاجون کو خیریت نہ لگی۔ اس نے کہا کہ ”یار یاجون“ میں ذرا ایک جھنجکی لے لوں۔ بہت خیر آ رہی ہے“ یہ کہہ کر وہ بس فوراً ہی سو گیا۔ اور اُٹھانے لیے لگا۔ اس کے غرائز نے جب اثر کیا یاجون بھی اٹھ گئے لگا۔ اس نے سوچا کہ اب کون سا ایسا کام رہ گیا ہے کہ ان شمس بھی جھنجکی لے لوں۔ اور وہ بھی سو گیا۔

باجو، اجو، دونوں جیسے گھڑے سے لڑ کر سوتے۔ آٹھ ان کی اس اہت کلی جب سر پر سورج آگیا اور انہوں نے دیکھا کہ دربار پر ہماری حفاظت اور بوندی کے ساتھ ان کے سر پر کھڑی ہے۔ یہ کہہ کر ان فرماں گئی تھی دے گئے۔

[illegible]

ماجراج پھرتی سے کھڑا ہوا۔ ”ٹھہریاں سے چلیں۔“

“کھانا”

”جاہلوت کے خلاف یہ جلتے ہیں۔ اب تک تو روشنی ہو چکا ہوگا۔ وہاں پر اسے پاروں سے نہیں گے اور اسے نہیں گے۔“

دو برس وہاں سے اٹھ جا روت کے اللہ کی طرف ہو لئے مگر وہاں پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔ نہ اللہ نہ اللہ والے۔ کوئی اللہ علی نگہی

کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سے پہلے ۱۲۵ آدمیوں کو نبی بنا دیا ہے۔ ان میں سے ان کے آقا خلیل اللہ علیہ السلام کو

الذیابیطس یاں گرم فہم ۵۹۔

دیر بعد ایک آدمی اصرار سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ اسے روک کر پوچھا کہ بھائی آج کی شب الوداع گرم نہیں ہوا۔

”لا“ ”کیسا“ ”و“ ”یہاں تو کوئی“ ”و“ ”گرم نہیں“۔“

”چاروت کہاں ہے؟“

اس آدمی نے دونوں کو غور سے دیکھا۔ "تم کب کی بات کر رہے ہو۔ جاروت نے مدت ہوئی یہ لڑاکا چھوڑ دیا۔ وہ اب حویلی میں

ہے۔ اس وقت دو آتش و ان

”حوالی دہ کیا ہوتی ہے“

۱۰ آیت نے انہوں کو کفر سے اور حجت سے ایک نکتہ قرار دیا ہے۔

1. *What is the main purpose of the study?*

”میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔“

۴۳۱

۱۰۸

اسرار کیا یا جنوں کی جان لے جب سے یہ چھاؤں

”اچھا! شکر کا بیٹا عمر ام کہتا رہا یا رہتا کہاں چلا گیا“

”جہ تو وہ سبکنا۔ مگر اس وقت ہم دیکھتے کیا ہے۔“

۱۱۲ جموں و کشمیر کے ایک مرتبہ منظر

”آئی ہمارا۔“ کب قمر پر چھو کے کہ ظلم کیا ہوتی ہے۔“

"نہیں! اب اس کے آگے ہم کچھ نہیں چاہیں گے۔" اور یاجوج ماجوج وہاں سے اٹنے پاؤں گھر۔

— 418 —

”ہم نے اپنے کتے روز و شب اس دوجار پہ صرف گئے اور دوجار ہے کہ جوں کی توں کھڑی ہے۔“ اس وقت یاجرج بھی دنگی ہو رہا تھا۔

”روز و شب“ یاجرج نے یاجرج کی بات کاٹی۔ ”مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہماری ساری زندگی ایک لمبی رات ہے جس کے سچے سچے صبح محض ہمارے رات کے کتے کرائے کا کارٹ کرنے کے لیے ضرور ہوتی ہے۔“

”صبح“ یاجرج بدحرہ لہجہ میں بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

”رات بہت ہو گئی ہے اب ہمیں سونا چاہیے۔“ یاجرج نے غمازی لہجے میں کہا۔

یاجرج یاجرج بہت راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔ سوچا تھا کہ لمبی تان کے سوئیں گے۔ آنکھیں دونوں کی نیند سے پوٹھل جھیں۔

مگر جب ہوا کہ پلٹنے کی نیند کا تب ہو گئی رات گئے تھکے ہو کر دنگی بدلتے رہے۔

”یار خیر نہیں آ رہی۔“ یاجرج نے ایک لمبی غمازی لی اور اٹھ کے بیٹھ گیا۔

”مجھے بھی نہیں آ رہی۔“ یاجرج بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔

یاجرج یاجرج اٹھ کے بیٹھ گئے تھے۔ نیند تو نہیں آ رہی تھی۔ اب کیا کریں۔

”رات ایسے کیسے کٹ گئی۔“ یاجرج بولا۔ آئیں ہی کریں۔“

”باتیں“ یاجرج افسردہ ہو گیا ”دو بار کو چاہتے چاہتے میری زبان اتنی زخمی ہو گئی ہے کہ میں بڑبڑاؤں ہی نہیں سکتا۔“

یاجرج بولا۔ ”میں تو روز صبح کو پتھری کے پانی سے غرارے کرنے کے بعد شال جراح کا دیا ہوا سر ہم لگا لیتا ہوں میری زبان کو تو اس سے بہت آرام آ جاتا ہے۔“

”و تو یار میں بھی کرتا ہوں۔ مگر تو روز کا تھکے ہوئے ذمہ بھرنے نہیں پاتے کہ سنے ذمہ پید ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پتھری کے غرارے سے اور شال جراح کا سر ہم نہیں لگتا کا تھوہ پتھلا کتے ہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

”ویسے یار میرا خیال ہے“ یاجرج سوچ کر بولا ”میری زبان بھی کچھ مونی پڑ گئی ہے۔“

”جب نہیں ہوئے تو زبان مونی ہی پڑے گی۔ ہمارا آپ کہا کرتا تھا بولنے رہو کہ کوئے گئے نہ ہو جائے۔“

”چند ٹھیک بات مگر یار ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔“

”ہاں۔“ یاجرج نے ایک لمبی سچی کے ساتھ کہا۔

ہاں ایک وقت میں ایک ہی لائق کام کیا جا سکتا ہے۔“ یاجرج نے یاجرج کے بیان میں قصوری سی اصلاح کر دی۔ پھر بولا۔ ”یار کبھی کبھی جب میں یاد ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں بول نہیں رہا۔ دوجار چاٹ رہا ہوں۔“ یاجرج یاجرج کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے شک تھا کہ بولتے وقت اس کے ساتھ بھی ایسی ہی ہوتا ہے۔

”یار اب سونا چاہیے۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

یاجرج یاجرج ایک سر جھیر روز ہوئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے مگر نیند کا کوسوں پہ نہیں تھا۔ یاجرج کو بے خوابی کے ساتھ عجیب جھکی ہوئی تھی۔ ہر بار اس کا منہ مکمل جاتا اور زبان باہر نکل آتی۔ زبان کو وہ ہونٹوں پر پھیرتا۔ تالو سے رگڑتا۔ پھر منہ نہ کر کے آنکھیں سونہ کے ساتھ ہو جاتا۔ پھر اس کا منہ مکمل جاتا اور وہ غمازی لیتا اور پھر زبان کو گردن دیتا۔ ہونٹوں پر پھیرتا۔ تالو سے رگڑتا۔ آخر اس سے نہ ہوا کیا۔ نیکل ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک آنکھالی لی اور دوجار کی طرف چلا۔

”کہاں“ یاجرج نے نوحا۔

”یار نیند تو آ نہیں رہی۔ میں نے سوچا کہ پھر مل کے دوجار ہی کو چاہوں۔“

”لاکھو؟“

”لاکھ تو کبھی نہیں ہے۔ ہماری آقاواں زبانیں اس انجی صیبت بھری دوجار کا کچھ نہیں جانتیں۔“

”پھر بلا حاصل عمل کیوں کیا جائے؟“

”یار مجھے تو اب سب ہی کچھ لا حاصل اور لائق نظر آتا ہے۔ مگر غمازی سے بچا رہی۔ کم از کم رات تو کٹے گی۔“

یاجرج نے قدم آگے بڑھایا۔ زبان نکالی اور دوجار کو چاٹنا شروع کر دیا۔ یاجرج بیٹھا کھتا رہا۔ دوجار چاہتے یاجرج کو کھتے کھتے اس کی زبان میں کھلی ہوئے گی۔ ”کیوں نہ میں بھی دوجار کو چاٹنا شروع کر دوں۔ تو یہ پہل عمل مگر زبان کی کھلی تو جائے گی۔“ اور یاجرج بھی اپنی لمبی زبان کے ساتھ وہاں پہنچا اور دوجار کو چاٹنے لگا۔

رات اٹھنے لگی تھی۔ کہ یاجرج تھک کر ذرا سانس لینے کے لیے رکا۔ اس نے نظر پھر کر دوجار کو دیکھا اور بہت مطمئن ہوا۔ دوجار چٹ چٹا کرتی دھن دھن روئی تھی۔ اس نے یاجرج کو لکھا۔ ”دیکھتا ہے۔ بے دوجار کا تو آقا ہم نے ہر کس نکال دیا ہے اب اس میں رہ گیا کیا ہے۔“

"ہاں ہم نے دوجا کو بہت چاٹ لیا ہے۔ مگر میں ڈر رہا ہوں۔" "مگر کیسی بھاریج نہ ہو جائے۔"

یاجوجی تشویش میں پڑ گیا۔ "یاد رہے ایک کہتا ہے مگر بھاریج کیا جائے۔"

"ہم سدا دعا کرنے کے کیا کر سکتے ہیں۔"

بھاریج جوجی ماجوجی نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ "اے ہمارے دپ تیری بخشی ہوئی لمبی دور بھری رات ہمارے لیے بہت سے صبح

کے شر سے ہمیں محفوظ رکھا اور اچالے کے حقے کو فیلج کر۔"



"وہ تو شب رہا ہے۔"

"کیا؟" ایک دم سے سب کی نظریں جبران کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

جبران نے ایک مرتبہ بھاریجان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر بولا "ہاں بالکل۔ یہ تو فیسی کی آواز ہے۔ وہ نہیں رہا ہے۔"

سب نے کان لگا کر اس دور کی آواز کو سننے کی کوشش کی اور اپنی ہر اسان نظروں اور تشویش بھری خاموشی سے جبران کے بیان کی توثیق کی۔ صرف ایک غبار تھا کہ اس تشویش میں حصہ دار نہیں تھا۔ اس کی خاموشی تشویش کی بجائے بے فطنتی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ مندر میں نے کہ ان کے کچھ بڑا تھا اپنی تشویش کو اپنے وقار پر قبضہ نہیں پانے دیا۔ ایک دھار کے ساتھ کسی قدر مہر وہ لہجہ میں بڑبڑایا "وہ بھی۔۔۔۔۔" اور چپ ہو گیا۔

دلچسپ میرے بھر بھری لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ریلیوں نے اسی طرح چپ بیٹھے ہوئے استفسار آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں خبر لے کر آتا ہوں۔" گوروہ چلا گیا۔

وہ سب اسی طرح چپ بیٹھے تھے اب شام کا احوال کا تھا۔ میر کا تعاقب کرتے ہوئے بھی ان کی نظریں زیادہ دور تک اسے نہیں دیکھ سکتی تھیں اور اب اس کی راہ سمجھتے ہوئے بھی زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر بہت جلد وہ میرا احوال سمجھنے کی راہ میں حائل نہیں تھا۔ کان اسی طرح دور کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

"اب تو کوئی آواز نہیں آ رہی۔" عسائیل بولا۔

جبران نے تھوڑی دیر کان لگا کر سنا۔ عسائیل کی تائید کرتے ہوئے بولا "ہاں اب کوئی آواز نہیں آ رہی۔ لگتا ہے کہ اس نے فنتا بند کر دیا۔"

بھاریجوں نے قدموں کی آہستہ سنی۔ دیکھا کہ میر واپس آ رہا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ سوالی ان کے ہونٹوں پر نہیں آ گھوس میں تھا۔ بھی ہوئی استفسار آمیز نظروں نے میر پر نہ کر لیا۔

"وہ تو وہاں ہے ہی نہیں۔"

"کیا؟" ایک مرتبہ گلاب چمک پڑا۔

"ہاں میرے عزیز وہاں نہیں ہے۔ میں نے قریب جا کر اس کی فہمیل پر ایک سٹ سے دوسری سٹ تک نظر ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔"

"تو وہ بھی....." مندریس نے اپنے پردہ نگار غرورہ لہجہ میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

"مگر کہاں گیا وہ؟" عسائیل نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"جہاں اس سے پہلے جانے والے گئے تھے۔" مندریس نے صحت کے ساتھ جواب دیا اس کی صحت نے مجھے رفیقوں کے لہجوں پر ہر گز گمانی۔ سب چپ کے چپ رہ گئے۔ دیر بعد عسائیل بڑبڑایا "کتنے ہمارے رفیق اس راہ گئے اور کم ہو گئے۔ جب بات ہے کہ ہر برقی اصرار کی خبر لے کر وہاں آئے گا اعلان کر کے جاتا ہے۔ مگر وہاں پر چڑھتے ہی اس کی زبان کو کالا لگ جاتا ہے۔ پھر وہ ہماری طرف نہیں دوسری طرف دیکھتا ہے۔ قیہ لگتا ہے اور دوسری طرف اتر جاتا ہے۔"

"دوسری طرف کیا ہے؟" عسائیل نے سوال اٹھایا۔

"دوسری طرف؟" سب نے حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔ سوائے عمار کے۔

مندریس نے عمار کو مطمئن دیکھا اور پوچھا "اسے عمار تو نے کچھ جانتا کہ دوسری طرف کیا ہے۔"

"دوسری طرف جاننے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں ہے؟" پھر وہی اصرار کیا دیکھ کر ہنستا ہے۔ "میرے برہم ہو کر سوال کیا۔"

"بجی دیکھ کر کہ وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

میر نے اس پر تڑپا دکھایا۔ کھڑے ہوئے ہوئے ہوا۔ "میں دیر اور پڑھوں گا اور خبر لے کر آؤں گا کہ وہاں کے اس طرف کیا ہے۔"

رفیقوں نے حیران و پریشان نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ دیر اور کی طرف جانے کے تیار کھڑا تھا۔

"تمہ سے پہلے جانے والے بھی یہی کہہ گئے تھے۔" عمار نے زہر بھری فہم کے ساتھ کہا۔

"مگر میں وہاں بھی آؤں گا۔" میر نے فہم سے کہا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔

میر جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا کہ بہت تیزی سے چلا تھا اور شہر کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ رفیقوں نے حد نظر تک اسے دیکھا اور پھر کان لگا کر سننے لگے ایک خوف بھرے انکار میں کٹ پڑی آواز جو وہی پارسی بچے تھے پکارتا ہے۔

جبران نے یکسوئی کے ساتھ کچھ سنے کی کوشش کی۔ پھر ہوا "وہ بھی۔"

"کیا؟ وہ بھی؟" رفیقوں نے چمک کر پوچھا۔

جبران نے ایک مرتبہ گلاب کی آواز پر کان لگائے "ہاں وہ بھی۔"

رفیقوں نے اپنے اپنے طور پر ہنسنے کی آواز کو سنا اور خوف بھری آواز میں بولے۔ "وہ بھی"

پھر وہ آواز آتی نہ ہو سکی۔ جبران نے بہت کان لگائے مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ ابھی سے ہوا "اب کوئی آواز نہیں آ رہی۔"

"مطلب یہ ہے کہ کیا؟" مندریس نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔"

دیر تک سب چپ بیٹھ رہے۔ آخر عسائیل نے جھجھکی لی۔ "کاش ہمارے پاس یہ جرحہ ہجرت کی زبانیں ہوتیں۔"

"پھر کیا ہوتا؟" عمار نے پوچھاری سے کہا۔

"پھر ہم اس دیر اور کلمات صحت میں چات ڈالتے۔"

"مگر کچھ کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی عمار نے اسی پوچھاری سے کہا۔

"ہمارے پھر چات ڈالتے۔"

"اور اس گل سچ کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔"

مندریس اپنے بزرگانہ انداز میں غلامی پڑے ہوئے ہوا کہ "عزیزو! میں عمار مت کرو۔ سر جڑ کر یہ سوچ کہ اس دیر اور کے مسئلہ کا حل کیا ہو۔"

"پھر ہے کہ ہم وہاں نہیں۔" جبران ہوا۔

عسائیل نے جبران کو کھڑ کر دیکھا "کیا کہا۔ وہاں؟"

"ہاں وہاں۔ اب وہاں ہی میں عافیت ہے۔ ورنہ یہ دیر اور ہمارے سر بہت غریبی آئے گی۔"

"مگر وہاں بھی میں زیادہ غراب کر سکی۔"

عسائیل نے غزل میں لت پت اور حور سے مندریس کو دیکھا اور درد کے ساتھ کہا "کاش ہمارے پاس یا جوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں۔"

"پھر کیا ہوتا؟" عمار نے مل کر کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات رات میں چاٹ ڈالتے۔"

"تو صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔"

"ہم پھر رات رات میں چاٹ ڈالتے۔"

"اور صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔" عمار نے چلے بٹنے لہجہ میں کہا اور زبردستی بھی فنی بنسا۔ پھر وہ دستا چلا گیا۔

جبران اور عسائیل دونوں سکے میں آ گئے۔

"عمار بھی؟" جبران اس سے آگے کھنکھڑا رہا۔

"اور وہ تو دیوار پر بھی ٹپک چڑھا ہے۔" عسائیل نے تعجب سے کہا۔

جبران اور عسائیل دونوں حیرت و دہشت سے عمار کو ننگے چلے جا رہے تھے جس کی فنی اونچی ہوتے ہوتے اب ایک لہجہ قہقہہ

بن چکی تھی۔



خواب اور تقدیر

ہاتوں پر سوار چپ سا دھڑے سا سر رو کے ہم اور تک اس راہ پر چلے رہے تھے کہ آگے آگے چلے ہوئے ابو طاہر نے اپنے ہاتھ کی ٹیکل کھینچی اور اطمینان بھرے لہجہ میں اعلان کیا۔ "تم نکل آئے ہیں۔"

"نکل آئے ہیں۔" ہم تینوں نے تعجب اور سہجی سے ابو طاہر کو دیکھا۔ "رفیق کیا تم حیرے کے پر اعتبار کر رہے۔"

ابو طاہر نے احماد سے جواب دیا۔ "قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ ہم شہر بے دغا سے نکل آئے ہیں۔"

پھر بھی ہم نے قائل کیا۔ آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر مرد گرد دیکھا۔ گرد و پیش کا پورا جائزہ لیا۔ کونے کے جانے پھانے در و دیوار واقعی نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ گرد و پیش ہی اور تھا تب ہمیں باور آیا کہ ہم نکل آئے ہیں۔ بس حیرت اپنے ہاتھوں سے اترے اور بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور اپنے پید کرنے والے کا شکر ادا کیا۔ پھر راہ کے کنارے کجوروں کے سائے میں بیٹھ کر اپنے توشے کو کھولا۔ ایک ایک مٹی ستو چھانگے اور لھٹا پانی پیا۔ اس ساعت میں لھٹا پانی ہمیں کتنا لھٹا اور میٹھا لگا۔ لگتا تھا کہ ہم پچاسوں نے آج ایک زمانے کے بعد پانی پیا ہے لہذا کی قسم اس آفت زدہ شہر میں تو غذا کھانا کھو بیٹھی تھیں اور لھٹا سے جیسے کوئی یک دم کھاری ہو گئے تھے یا شاید ہم اسے بے حذر ہو گئے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہمارے لئے بے لذت ہو گئی تھیں۔

یہ سب کچھ اس شخص کے وارد ہونے کے بعد ہوا۔ وہ شخص بالآخر کھڑے پے سوار یا عمار پہنچے۔ پڑھا جانے سے احوال کھوار نہ رہ کر نئے شہر میں داخل ہوا۔ لوگ کچھ کے نام نہ مان کا اور دو دو آگلی گلی کوچہ کوچہ پر خبر پھیلی۔ لوگ سرور ہوئے۔ امام کے قصور سے کھوار ہوئے۔ مرنے والے کچھ گھروں سے نکلے اور اس کے گرد اکٹھے ہوئے۔ کس شان سے سواری قصر الامارہ کی سمت چلی۔ لگتا تھا کہ ہمارا شہر اٹھ رہا ہے۔

قصر الامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے کھڑے کی ہانگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔ رخ کرتے کرتے ڈھنچا ڈھنچا

کھولا۔ غصہ اور صورت کھد درہاں۔ نیام سے شمشیر نکالی اور کڑک کر کہا کہ اسے کوکوا تم میں سے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ جان لے کر میں آ گیا ہوں۔ سب مٹانے میں آ گئے وہ بھی جنہوں نے دیکھا اور جاننا کہ کون ہے جڑا گیا ہے وہ بھی جنہوں نے دیکھا شہر تباہ ہوا کہ کون ہے جڑا گیا ہے۔

اس نے اپنا اعلان کیا اور قصر الامارہ کے اندر چلا گیا۔ لوگ دیر تک سارے کھڑے رہے۔ آخر کو الامارہ نے سر ہرمت کو ڈی۔ آفس بھرے لہجہ میں بولا کہ "شیر کو ف پر خدا رحمت کرنے کا شکار اس نے کس کے لئے کھینچا تھا اور وہ کون ہے؟"

"کون ہے جہاد اور وہ ہے؟"

"اے کوکوف ہے تم پر کہ ابھی تک تم نے نہیں سمجھا کہ یہ کس باپ کا بیٹا ہے اس باپ کا جس کا باپ نہیں تھا اور جسے کوکوفی نے جتنا تھا۔"

"زیادہ جانتا ہے؟" بے اختیار کسی کی زبان سے نکلا۔ اور ایک لمحہ گھبر سناٹے میں آ گئے۔

اس کے آنے کی خبر پہنچی تھی اور کوہ اور نیلیاں خالی اور خاموش ہوتے گئے۔ میں منصور بن عثمان اللہ جی بھرے کوچوں سے گزر کر قصر الامارہ تک پہنچا تھا اور خالی نیلیاں اور کوکوفی کرتے کوچوں سے گزر کر واپس گھر پہنچا اور جب اس بچہ رام رات کے بعد صبح ہوئے پرس گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر بدل چکا ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس شہر کو پہلی چڑ سے گزراؤ کی مثال اٹھنے دیکھا تھا۔ اب میں اسے سید اہل ہوں کی صورت لھٹاؤ دیکھ رہا تھا اور میں دل میں دیا کہ شہر کس شور سے سراہا ہے ہیں اور کتنی رحمت سے آ رہے جاتے ہیں۔

میں گرفتار دل اپنے رفیق دیرینہ منصب منصب ابن بشر کے پاس پہنچا گھو گھیر ہو کر کہا اے مصعب تو نے دیکھا کہ کوکوفی آن کی آن میں کتنا بدل گیا ہے۔

مصعب نے مجھے گھور کے دیکھا اور کہا کہ "اے منصور تعجب مت کہ دورۂ ہشت ہوں۔"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "رفیق کیا تو وہ نہیں ہے جہل اونچی آواز سے بول رہا تھا۔"

دوبارہ "کل سب سے اونچی آواز میں ابوالمنذر بولا تھا اور وہ قصر الامارہ کی دیوار سے لھٹا رہا ہے۔"

یہ کہہ کر دوبارہ رفیق مجھ سے شنائی سے رخصت ہوا اور قصر الامارہ کی طرف چلا گیا۔

جب میں نے جان کہ کوکوفی ابھی بدل چکا ہے اور واقعی مجھے ہشت ہونا چاہیے۔ بلکہ نہیں ہونا چاہیے۔ قسمیں بن سہر کو میں نے دیکھا

کہ وہ بھلا اور اچھا بیٹھ کے لئے چپ ہو گیا۔ اپنی زبانی کے آدمی اسے پکڑ کر قصر الامارہ کی چھت پر لے گئے۔ کہا کہ بول کیا بولا ہے۔ اس نے اونچی آواز میں اپنا اعلان کیا کہ اس خاموش شہر میں ہر گھر میں اس کی آواز سنائی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے چھت سے نیچے پھیل دیا گیا۔ قصر الامارہ کی دیوار سے کتنی دیر وہ سسکتا رہا۔ دیر بعد اس کا دوست عبداللہ بن مسعود اسے گزرا اور اپنا غمگیناں کر اس کے گنگے پر پھیر دیا۔ ایک یوزر سے نے سرگوشی میں اس سے کہا کہ تو نے خوب حق دیا اور اس نے مسکت جواب دیا کہ میں اپنے عزیز دوست کو سسکتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔

میں یہ لٹش دیکھ کر وہاں سے بھاڑ اور نیلیاں نیلیاں پریشان بھرتا پھرا لگا رہا تھا کہ میں کو نے میں نہیں ہوں۔ خوف کے سحر میں ہلک رہا ہوں۔

خوف کے سحر میں بھٹکتے بھٹکتے میری ذہن بھڑا بھڑا طائر سے ہوئی اور ابوطاہر نے مجھے حنظل زبیدی اور بارون ابن کلیل سے ملایا کچھ دنوں تک ہم چاروں گونگے بھرے بنے اس خوف کے سحر میں بھٹکتے پھرے۔ آخر کے تیش ہم نے سہر کا دانن ہاتھ سے چھڑا اور سہر جڑ کر پیٹھا اور ساچا کہ کسی صورت یہاں سے نکل چلے۔ اس جو بچہ حنظل زبیدی رو پڑا۔ بولا "میں کوکوفی کی مٹی ہوں۔ اس مٹی کو کیسے چھڑاؤں۔"

بارون ابن کلیل بولا "ہر چند کہ میں مدینہ کی مٹی ہوں مگر پائے والے کی قسم اس قریہ سے مفارقت مجھے رلانے کی کہ میں نے اپنی جانائی کے لایا اسی شہر کے کوچوں میں گزارا ہے۔"

جب ابوطاہر نے کہ ہم سب سے بڑا اقامیری طرف دیکھا۔ "اے منصور تو اس باب میں کیا کہتا ہے؟"

میں نے عرض کیا "رفیق حضور اکرم کی یہ حدیث یاد کرو کہ جب تمہارا شہر پر ٹھگ ہو جائے تو وہاں سے ہجرت کر جاؤ۔"

پیکلام بن کر رفیق قائل ہو گئے اور نکل چلنے کی تیار ہواں کرنے لگے۔

ہم نے شہر سے لھٹا کتنا آسان ہانا تھا مگر کتنا مشکل نکلا۔

شہر کے دروازوں پر پہرہ تھا۔ آنے جانے والوں پر روک لوگ تھی۔ کتنی مرتبہ ہم دونوں دروازوں تک گئے اور پھر دروازوں کو چوکنا دیکھ کر چپکے سے واپس چلے آئے۔ کوکوفی ہر ٹھگ ہوتا ہمارا ہاتھ تک ہوتے ہوتے وہ چہ وہ ان کی مثال بن گیا۔ اس کے اندر ہم ایسے تھے جیسے چوہے وہ ان میں چوہے کہ چکر کا میں اور نکلنے کی روانہ نہ کیا۔

نکلنے کی صورت نہ دیکھ کر ہم بی جان سے بیزار ہوئے بارون ابن کلیل نے لکھی آؤ بھینچی اور کہا کہ "کاش ہماری مائیں ہاتھ ہو

جاتیں اور ہمارے باپوں کے نئے ضائع ہو جانے کا نہ کم پیدا ہوتے نہ کمیں یہ سیادان دیکھتے پڑتے۔"

جعفر بن زبئی روایا اور یوں "اوائے ہو کم پر کہ ہم اپنے عی قرے میں رنج اسیری کھینچے ہیں اور دوائے ہواں قرے پر کہ وہ اپنے بچوں کے لئے سوغی ماں بن گیا۔"

یاس کی اس انتخاب پر پختی کر ہم جری بن گئے۔ مرکا کیا نہ کرنا؟ بس کمر ہمت باندھ چل کھڑے ہوئے کہ ہرچہ بڑا ہوا۔ معلوم نہیں یہ کیسے ہوا پھر سے اداروں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے یا نیند آ گئی۔ بہر حال ہم اب شہر سے باہر تھے اور آ زاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

شام کے سامنے پڑھتے جا رہے تھے اور ہمارا گرم سے فطری ہونے لگی تھی۔

"ہم شہر واد کا پانی پے اور سڑک پہا۔"

"اسے آئی کیا پیدائ کوئے کے کلوں سے پڑا دیا ہو؟"

یہ دلیل سب کو کھل کر گئی۔ ہم اس وسیع کالی ہوئی رات میں سفر کرنے کے لئے کریں کس کرتا ہو گئے۔

"مگر جانا کہاں ہے؟"

اس سوال نے ہمیں چڑھایا۔ ہم تو بس نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تو سہاوی ٹھس تھا کہ جانا کہاں ہے۔

ابو طاہر نے چل کیا۔ بھرا کیا۔ "دیکھئے اور کہاں؟"

میں اور جعفر زبئی اس تجویز کے موافق ہوئے مگر ہماروں بن کیل سو فی میں پڑ گیا۔ دسے لہجہ میں یوں "اگر دیکھیں گی کوئی ن چکا ہو"

۴۶

ہم سب نے اسے برہمی سے دیکھا۔

"اسے دیکھئے؟" جعفر زبئی یوں "تو اس خود شہر کے بارے میں جب کہ تو خود وہاں کی مٹی ہے ایسا سوچا ہے۔"

ہماروں بن کیل بھر لگا رہا۔ "ہم شہر کو بے لگ اب شہر مہارک کی زمین آ سان ہے وہاں کی مٹی ستر اور پانی مصلابہ مگر میں اس شہر کی صحت آئے دالوں سے ملا ہوں۔ میں نے انہیں پریشان کیا۔"

اب ہر کم چپ ہو گئے کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مگر ہماروں بن کیل ابھی چپ نہیں ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے یوں "ہم شہر میں سوچنا ہوں اور حیران ہوا ہوں کہ کون سے صورتوں نے اوائے شہر کی جلدی مطلب ہو گئے۔ کتنی جلدی ان کے دہان پر آئندہ اور رات میں

پریشان ہو گئیں۔"

ابو طاہر نے اسے برہمی سے دیکھا۔ "اسے کیل کے غلط بننے تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو اسلام کی حقانیت سے انکار کرے گا۔"

ہماروں بن کیل یوں "بزرگ میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے کہ میں خدا نے بزرگ ویرت کی وعدانیت میں ملک کروں اور اسلام کی حقانیت سے انکار کروں مگر یہ کونف۔۔۔۔۔"

ابو طاہر نے فیسے سے اس کی بات کالی "کوئی کیا؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"ہاں میں میں سوچتا ہوں کہ کوئی کیا اور کیوں؟ بار بار اس خیال کو دفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال میرا امن گیر ہوتا ہے کہ مہارک قرعوں کے کچ کوئی کیسے سودا ہو گیا اور کتنی جلدی سودا ہوا۔ ہجرت کو ابھی ایسا کونسا زمانہ نہ کر گیا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ ابو طاہر کے حراج کی درہمی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بات چلی میں کالی اور کہا کہ "رفع اسیری تجویز یہ ہے کہ اس شہر میں جسے حق تعالیٰ نے شہر اس قرار دیا ہے۔ بے لگ دنیا کا خالوں سے بھر جائے اور نہ میں فساد سے تہہ دالا ہو جائے مگر کہ کے مہارک شہر کے امن میں نقل نہیں آئے گا۔"

سب رفیقوں نے میری اس تجویز پر صاف کیا اور ہم فوراً ہی باتوں پر سوار ہو گئے۔

تاریکی بہت تھی کہ یہ چاند کے شرار کی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ مگر ادا راجد پہ میں بھینے لئے جا رہا تھا۔ اب رات ہو چک تھی اور آ سان سے اتنی غشی نے ہمارے دلوں میں ترک پیدا کر دی تھی۔ شہر امن کے تصور میں امن اور پانی کے نشہ سے سرشار ہم بڑے چلے جا رہے تھے۔ آق پر بیٹھے بیٹھے اچھڑا گئی میں نے کیا حسنین خواب دیکھا کہ میں شہر امن میں یک پاک بزرگوں کے کچ چیتا ہوں اور کوئی کا احوال سنا ہوں۔ اچانک کان میں ایک آواز آئی۔ "یہ تو ہم بھرا دیں آ گئے۔" اور میں نے بڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ اب ترکے کا وقت تھا اور سامنے کوئے کے دروازہ پر نظر آ رہے تھے۔

"یہ تو ہم بھرا دیں آ گئے۔" جعفر زبئی کہہ رہا تھا۔

ابو طاہر نے ہماروں بن کیل نے حیرت و اشت سے ہماری نظروں سے ان دور دور کو دیکھا۔

"مگر کیسے؟" میرے من سے نکلا۔

ابو طاہر نے چل کیا بھرا کیا۔ "رات بہت کالی تھی کہ میں نے راہ پر دھیان نہیں دیا جس رات آئے تھے اسی رات چل پڑے۔"

ہم سب چپ تھے۔

"اب کیا کریں۔" جھپٹو ریتی نے سوال کیا۔

ایک طرف ہر نے تال کیا اور کہا "رفیقو! آپس اب محال ہے کہ پیرے والوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے شاید قدرت کو ہمارا یہاں سے لٹکانا منظور نہیں۔"

بارون تین کیبل نے لفظ اسانس بھرا "درست کہا" کو فہم داری مقدحہ ہے۔

اور میں مصدور تین نعمان اللہ یہی افسردہ ہو کر بولا کہ "ہاں کہ ہمارا خواب ہے تقدیر ہماری کو فہم ہے۔"

اور ہم تھک ہار کر واپس گونے میں آ گئے۔



شور

"کیا خیال ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔"

"اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"خدا"

"خدا" وہ سوئی میں پڑ گیا "یار confusion بہت ہے۔" پھر وہ چپ ہو گیا اور چائے پینے لگا۔

میں بھی چپ رہا اور چائے پیتا رہا۔ پھر باہر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ میں نے کان کھڑے کئے۔ غور سے سننا اور کھڑا ہوا "ضمیرہ کیا۔" باہر جا کر ضمیرہ فریاد کیا۔ واپس آ کر ضمیرہ کھولا اور ہم دونوں نے اکٹھے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

"پڑھ چکے کے بعد" اب کیا خیال ہے تمہارا۔

"یاد اتنی غریب ہے۔ کوئی نئی تفصیل تو ہے نہیں۔"

"پھر بھی کیا خیال ہے تمہارا۔ اب کیا ہوگا۔"

"اب کیا ہوگا۔" سوئی میں پڑ گیا "یار بیل حاسواں ہے۔"

"پھر بھی۔"

سوچتے ہوئے بولا میرا خیال ہے..... "مگر اگر مرد کچھ کر پھر چپ ہو گیا" یار یہاں شور بہت ہے۔"

میں نے آس پاس کی میزوں پر نظر ڈالی۔ آس پاس کی سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ چائے پینے والے چائے کم پنی رہے تھے بائیں زیادہ کر رہے تھے۔ ہماری میز کے بالکل برابر کی میز سب سے زیادہ پر شور تھی۔ چائے کی گم غلری زیادہ۔ اتنی اونچی آواز میں بول رہے تھے کہ ان کے ہونے آس پاس کی کسی میز پر اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں تجسب کیا۔ تھوڑا فسر بھی کیا۔ کیا ہے لگے لوگ ہیں۔ ایسے جیسے ہاتھیں کر رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

دور کی میزوں کا ہاتھ ڈالیا۔ کچن کے برابر کے گوشے میں کئی میزیں خالی نظر آئیں۔

"چلو اور چلتے ہیں۔"

ہم دونوں اٹھ کر بچن کے برابر والے گوشے میں جا بیٹھے۔ یہ گوشہ واقعی پر امن تھا۔ بات اطمینان سے ہو سکتی تھی۔ چائے کا گلیا آ رہا دیا۔ بھروسہ کی طرف دیکھا "یہاں بات ہو سکتی ہے۔"

"ہاں یہاں بات اطمینان سے ہو سکتی ہے۔" اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا اب کیا ہوگا۔"

اسی ٹھنڈی دھند میں داخل ہوئے اور ہمارے پاس کی میز پر آ کر بیٹھ گئے۔ ایک کی نظر ہماری میز پر رکے ضمیر پر پڑی "اچھا ضمیر شائع ہو گیا ہے۔" اللہ کر قرب آ جائے۔ "ڈور کچھ سکھا ہوں۔"

"ضرور" یہ کہتے کہتے میں نے وہ ایک درتی اخبار اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔

ضمیر نے کردہ اپنی میز پر جا بیٹھا اور سامنے پھیلا کر پڑھنے لگا۔ حمزہ کی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ضمیر کو آڑا "اچھا ضمیر آ گیا" یہ کہتے ہوئے اٹھا اور قرب آ کر اس پھیلے ورق پر جھک گیا۔ اس نے یہ بات کسی قدر اونٹنی آواز میں کہی تھی۔ اس پاس کی کئی میزوں پر جہاں یہ بات سنی گئی کان کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک اٹھ کر آئے اور اس میز کے گرد کھڑے ہو گئے۔

"کیا کہتا ہے ضمیر۔"

استفسار اتنے تھرے۔ کوئی تائیدی آواز کوئی اطمینان کی نوٹ "کوئی تائید ہر ایک بھرکت" لہجہ تھوڑا تیز ہوتا گیا۔ آواز میں اونٹنی ہوتی چلی گئیں۔

ہم دونوں چپ اُردو دیکھتے رہے۔ بھروسہ بے لگائی سے ہوا "یار بہت شور ہے یہاں بیٹھ کے تو بات نہ کرنا مشکل ہے۔"

"تو پھر نہیں یہاں سے۔"

وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ سوچا کہ کینے ڈی بیس میں فضا پر سکون ہوگی۔ مگر وہاں قدم رکھا تو لگا کہ شور کے سدر میں اتر گئے ہیں۔ ہر طرف چائے خانوں میں بھاگلا۔ ہر جگہ شہر جگہ شور۔

"یار بہت شور ہے۔"

"کچھ میں نہیں آئی گا آج اتنا شور کیوں ہے۔" میں نے کہا۔

"اور رش دیکھو لوگ کہ ہر شہر مارا چائے پینے اور گیس مارنے کے لیے لگا ہوا ہے۔ لوگ کہتے بے فکرے ہیں۔"

"اتنا شور اتنا رش۔ اس شہر میں تو ہمارے لیے سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔" میں نے اس کی تائید میں کہا۔

"یار یہ شہر کتنا خاموش ہوا کرتا تھا۔ ہم کتنے اطمینان سے اس سڑک پہ چلا کرتے تھے۔"

میں نے سڑک پر دو رنگ ٹھہر دوڑائی۔ "بھیس" سڑک میں۔ لگیساں اڑکھائیں اور سب سے بڑھ کر سکون۔ ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ شور اٹھتا تو بے بس اس ساعت میں جب ہم ایک خاموش گوشے کی تلاش میں تھے۔ اچانک ہمیں احساس ہوا کہ شہر میں کتنا بھگم ہو گیا ہے اور شور کتنا بڑھ گیا ہے۔

اب شاید اس کے یہاں بھی بات کرنے کی خواہش زور پکڑ گئی تھی۔ خاموش گوشے کی تلاش میں جتنا میں سرگرم تھا اتنی ہی دوسرے سرگرم تھا کہاں کہاں پہنچے اور کہاں کہاں سے مایوس پھرے۔ اور بات کرنے کی خواہش تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہمیں بہت اہم مسائل پر گفتگو کرنی ہے۔

"رہنمائی سب بھرے ہوئے ہیں۔ آؤ چلو کھلی باغ چلتے ہیں۔"

ہم اس پر شور مٹا رہے۔ گزر کر ایک خاموش سڑک پر پڑے۔ چار قدم چل کر کھلی باغ پہنچ گئے۔ کھلی باغ کی فضا میں کتنا سکون تھی آسودگی تھی۔ جہاں تہاں اکا دکا آدمی۔ کوئی کسی روش پر چل قادی کرتا ہوا کوئی خاموش کسی بیٹھ چھٹا ہوا۔ ہم بھی ایک بھری بیٹھ چھٹے گئے۔ شہر کا سمندر پار کے آئے تھے۔ سستار ہے تھے۔ قریب سے ایک جھڑا گزرا۔ حمزہ آگے چل کر نوجوان نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

دونوں درختوں کے سائے میں چلتے چلتے ایک گھنے بیڑی ٹوٹ میں گئے اور غروں سے اوجھل ہو گئے۔

"تھکلیا کا پتہ نہیں چل رہا۔ بہت کھینچوٹن ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

پانی رے پانی تارنگ کہا۔ دور سے آواز آئی۔

آواز قریب آتی تھی۔ ایک نوجوان ٹرانسپسٹر ہاتھ میں لٹکا کے چلا آ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس کے چٹخے پر بیٹھ۔ ٹرانسپسٹر ایک طرف رکھ کر جوتے کے کتے کو لے لگا۔ لگانے نے ہم دونوں کو اپنی طرف حوجہ کر لیا۔ کان لگا کر سننے رہے سننے رہے۔

"یہ قحطی؟"

"ہاں اور ساتھ میں کشور کمار۔" میں نے کہا۔

گھاس کے بعد ٹرانسپسٹر کی آواز اونٹنی ہوتی چلی گئی۔ D کا ایک گانا دوسرا گانا تیسرا گانا پھر منگلت کرتے چھ نوجوان آئے۔

قرب ہی گھس کے ایک تختے چاہوں نے بھی ابراہیل دیا۔ جن کے پاس نیپ رکھا رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی پند کے گانے سننے شروع کر دیے تھے۔

"یار تو بہت بدعت ہے۔"

"اور ان کی پند کتنی بے ہودہ ہے (Vulgar) مجھے اس نوبی پر سخت حسرت رہا تھا۔"

"ہمیں آج اس شرمیں کہیں پتا نہیں ملے گی۔"

"پتہ نہیں لوگ گاتائی ہوئی آواز میں کیوں سنتے ہیں۔"

"دھبے فریور ہو چکے ہیں۔ شہر اتنا ہے کہ کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی ایسے میں آدمی کیا بات کرے۔"

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ ایک طرف سے ٹرانسٹر دوسری طرف سے نیپ رکھا رکھا۔ دوایم شور۔ بائیں شور۔ ہم جڑا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف روشوں پر چل چلی تھی۔ بائیں میں سیلیوں کا جھم جڑا ہوا تھا۔ ہم بائیں سے بائیں گھر آئے۔

"نہیں۔"

"بی بی ہی سنا چاہیے۔" یہ کہتے کہتے وہ شروع ہو گیا۔ آخر وہ بائیں میں خود ہی بات آگئی ہوئی تھی۔ بلکہ کتنا کھٹک رہا تھا۔ جب تک کانا نکل نہیں جاتا ہم دونوں میں سے کسی کو نہیں آسکا تھا۔ کانا نکلنے لگا تھا۔ مگر اسی دم پھر پچھلے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ پچھلے چلنے والا تیز قدم چل رہا تھا۔ ہم نے اپنی رفتار درست کر دی۔ جلدی وہ آگے نکل گیا۔ اب اہمیتان سے بات ہو سکتی تھی۔ مگر یہ سڑک ایسی تھی کہ شام پڑے لوگ چل چلی کرتے دھڑ آتے تھے اور جو صاحب ہمارے پیچھے آ رہے تھے وہ اسے اہمیتان سے چل رہے تھے کہ ہماری رفتار میں سستی آ جانے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان کچھ مصلحت پیدا نہیں ہو سکا۔

"پلو پلو پچھلے چلے ہیں۔ میں نے جو بڑھتی تھی۔"

"تم تو اکیلے ہی رہتے ہو۔"

"اور کیا۔"

"پھر چلتے ہیں۔" وہاں اہمیتان سے بات کریں گے۔

پلٹ لے۔ مگر جا کر اپنا کر دکھلاؤ۔" غصہ۔

چلتے ہوئے اس نے ایک نظر اوروگرد پر ڈال دیا۔ "یار تمہارے پاس رہنے کو نہیں ہے۔"

"رہنے کو نہ ٹرانسٹر۔"

"ہاں تو اس وقت بی بی ہی سنتے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ بی بی ہی کچھ بتائے گا۔"

"بالکل بتائے گا۔ دیکھو ان اپنا رہنے کی جگہ سننا چاہیے۔ مگر تم نے تو یہ کھڑا رکھا ہی نہیں ہے نہ رہنے کو دی۔"

"ایسے کھڑا کچھ یاں اکٹھا کیا کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور بی بی ہمارے کھڑا ایک کھڑا ہے۔"

"اکی لے کر پلا نہیں۔"

"اچھا کیا سکون ہے ہو۔" رک کر ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے سامنے بھی سب چھڑے ہیں۔

"کیسے جاتا۔"

"یار یہاں خاموشی بہت ہے۔"

"یہ کھڑا نہیں ہے۔ قیامت میں رہتے والوں کا پتہ نہیں چلتا اور نہ میرے دائیں بائیں جتنے قیامت ہیں ان میں چورے چورے خاندان آباد ہیں۔"

میں نے سوچا کہ پہلے کچھ جاننے کا اہتمام کر لیا جائے۔ چائے سامنے رکھی ہوئی بات اہمیتان سے ہوتی ہے۔ دو دو دیکھا سوچو

تھا۔ چائے کی پتی اور گٹنی تو رات ہی ہے۔ کچل میں پانی بھر اور پھر پکڑ لیا۔

"یار تمہارے پردوں میں کوئی کچھ بھی نہیں ہے؟"

"ارے یار بہت ہیں۔"

"آواز کو کوئی آ نہیں رہی۔ کسی قسم کی آواز ہی نہیں ہے۔"

"میں نے کہنا کہ یہ قیامت ہیں۔ تم مجھے حساب سے مت دیکھو۔"

میرے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا۔ تو پھر اچھڑا رہا کہ ہوا۔ یار بہت سنا ہے۔ لگتا ہے کہ جنگل میں آگے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دھیان سننا ہے پانی کی طرف تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو۔"

"چائے بنا رہا ہوں۔ ابھی تیار ہوتی ہے۔ پھر طہیّان سے باتیں کریں گے۔"

"بھڑا دیار۔ وہیں اپنے فکّانے پہ چل کے چائے پیتے ہیں۔" وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہاں سے تو مجھے دشت ہونے لگی۔"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "یہاں طہیّان سے بات ہو سکتی تھی۔"

"ٹھیک ہے مگر" اس نے کھائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "یہاں جینے کے تو خجروں کا وقت نکل جائے گا۔ اپنے فکّانے پہ چلتے ہیں۔ وہاں رہنا ہے۔ خبریں بھی سنی جا سکیں گی۔" کاہنا "یہاں تو لگتا ہے کہ دنیا سے کٹے چلے ہیں۔"

واقعی اس کمرے میں بند ہو کر تو دنیا سے میرا رشتہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ چند نہیں چلتا کہ اب رہنا یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اصل میں اس کمرے میں کوئی ایسا درخت نہیں تھا جہاں سے آسمان نظر آتا ہو۔ آسمان نظر نہ آئے تو یہی لگتا ہے کہ دنیا سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ باہر کلر کھڑے ہوئے۔ سڑک خالی خالی تھی۔

"کیا ناغ کیا؟" اس نے تھوڑا بچک کر کھائی پر بندھی گھڑی دیکھی "کمال ہے آج اتنی جلدی سنا ہو گیا۔"

واقعی سنا تھا۔ کوئی کوئی رکشا گزرتا تو تھوڑا شور مٹا مگر اس کے گزر جانے کے بعد خاموشی اور گہری ہوجاتی۔ جیسے اپنے قدموں کی چاپ ستائی دے رہی تھی۔ ہم آہستہ چلے گئے۔

اپنے فکّانے پر پہنچے۔ آج یہ سستوران اتنی جلدی خالی ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسے بھرا بھڑ کر گئے تھے اس وقت شور سے کان پڑی آواز ستائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف ایک میز پر دو شخص بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی رخصت ہو گئے۔ اب صرف ہم رہ گئے۔ چائے کا آرا رہا۔

"آج ابھی سے یہاں ان لوگوں نے لگا۔" وہ بولا۔

"اچھا یہی ہے کھانہ میں بات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں اچھا یہی ہے۔" مگر سوچ کر بولا "پارکینڈون بہت ہے۔"

"پارکینڈون پہلے نہیں تھا؟"

"ٹھیک کہتے ہو پارکینڈون پہلے بھی تھا۔" مگر سوچ میں ادب کیا۔ "آفر زبان کوئی" اس کے چپکے کاہنے پہ تو ابھی واضح نہیں۔ مگر میرا

خیال ہے۔" وہ چل پڑا تھا کہ اتنے میں چائے آگئی۔ چپ ہو گیا اور چائے بنائی شروع کر دی۔ چائے بناتے بناتے بولا "یار وہ لڑکی اچھی تھی۔"

"لڑکی؟ کوئی لڑکی۔"

"وہی لڑکی جو کھیتی باغ میں نظر آئی تھی۔"

"اچھا وہ" اور وہ لڑکی اپنی بری بھری گات اور شاداب بچھانے کے ساتھ تصویر میں پھر گئی "ہاں اچھی تھی۔"

جیسے ہمارے ہوئی ہو اور اورا کا تپ ایک طعنہ اچھلا آ جائے۔ مجھے تو ایسا ہی لگا۔ وہ بھی بٹاش نظر آ رہا تھا۔ پھر ہم نے اس ٹوٹھو ارجم کی جڑ بھینچا۔ ت پر غور کیا اور سنے کیا کر لڑکی واقعی اچھی تھی۔

"پار" وہ سوچتے ہوئے بولا "لڑکی تو ہماری زندگی سے نکل ہی گئی۔"

میں نہیں پڑا "آئی کب تھی۔"

"پھر بھی" سنجیدگی سے بولا "آئی کب سے کم از کم ابھی دیرانی تو نہیں تھی۔"

میں پھر نہیں بولا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔

سوچ کر بولا "دو کھن دکھائی دی؟"

میں پھر بولا "کون؟"

"وہی"

اب میری کھن میں آیا کہ کسے پھر ہوا ہے۔ طبیعت افسردہ ہو گئی "نہیں یار۔"

"اس کے بعد سے نظری نہیں آئی۔"

"نہیں"

"توبہ ہے۔"

میں نے خود اس بات پر اس وقت کتنا توبہ کیا تھا۔ توبہ اور افسوس کر کے کا رخ ہو گیا تھا اب جو اس نے اظہار کیا تو مجھے پھر ایک مرتبہ توبہ ہوا کہ واقعی ایسی ہو چلی ہوئی کہ پھر نظری نہیں آئی۔

"یار تمہارے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔"

”اور جو ہر طرف آدی کے ساتھ ہوتا ہے“ میں نے ٹکرا دیا۔

ہم دونوں ہی مسرودہ ہو گئے۔ پھر نہ اس نے کوئی بات کی نہ میرا بات کرنے کوئی چاہا۔ چپ بیٹھے رہے اور چائے پیچے رہے۔ بی بی کی خبروں کا وقت آیا اور نکل گیا۔ ریڈیو پاکستان پھر آل انڈیا ریڈیو۔ سب خبروں کے وقت نکل گئے۔

”چلیں ڈار۔“

”ہاں جانا چاہیے۔“

ہم چل کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے گھر کی طرف۔ میں اپنے گھر کی طرف۔



صبح کے خوش نصیب

ہم لوگ سچ جنگل میں تھے اور گاڑی رکھ کر چلی تھی۔ کتنی مروجہ گمان ہوا کہ گاڑی اب چلی کر نہیں چلی۔ کتنی مروجہ گاڑی سے باہر بکھرے ہوئے مسافر سنی دینے والی تھیں۔ اشارہ لے کر ایک جھپک دابہں اپنی اپنی نشست پر آئے اور دم سادہ کر بیٹھے گئے کہ اب گاڑی چلی گی۔ دم سادہ بیٹھے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب گاڑی حرکت میں آئی ہے۔ گاڑی حرکت میں آئی تو آئی ہی نہیں۔ آئی تو اس قدر کہ جیسے مشکل سے تھوڑا کھڑے اور اچان کو تھوڑا جھٹکا کھڑے ہو کر پھر چلنے سے پہلے ہی رک گئے اور گاڑی ایک تھوڑی دیر کے بعد پھر حرکت ہو گئی۔ مسافر بیٹھے رہے بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے بے اطمینان ہو کر پہلو چلا۔ کوئی چیز اور ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ایک کر کے پھر گاڑی سے اترے اور پٹری پر چل کھڑے کرنے لگے۔ کسی نے پٹری کو پار کیا اور ریلوں کے سامنے میں جا بیٹھا۔

”ابھی گاڑی کیوں نہیں چلتی۔“ سچے نے پوچھا کہ اس سے سوال کیا۔

”چلی گی۔“

”کب چلی گی؟“

”ہاں ابھی چلی گی۔“

مگر وہ کس دن سے یہ جواب پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہی تھی اس نے سنا اور باہر بھاگنے لگا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے گود کے بچے کو پہلے غالی باتوں سے بہانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا اور بیٹنے پر دست درازی کرنے لگا تو اس نے ٹھٹھکی کا دامن اٹھا کر بچے کا منہ اندر کیا اور دامن گرالیا۔ ٹھٹھکی کا دامن اس نے اتنی جا بکدستی سے اٹھا لیا کہ بیٹے کے ایک بے معنی سے گونے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خبر اس سے اتنا پہنچا تو چل ہی گیا کہ اس ٹھٹھے لباس کے اندر کتنا روشن بدن چھپا ہوا ہے۔

میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں جو جی بیکسوئی سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بالآخر اخبار پڑھتے پڑھتے تھک گئے۔ اخبار کو ایک طرف رکھا اور جڑا۔ ”بہت دیر ہو گئی۔ آخر گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟“

"کوئی کراٹھ ہو ہے۔" قریب میں بیٹھا ہوا ایک کس دھان آدھی بولا۔

"میرے خیال میں تیرا کام آ رہی ہے۔" دوسرے نے ٹھکرا لیا۔

"تیرا کام؟" برف کس والے نے نکالی پرنگی خوبصورت کھڑی کو دیکھا "تیرا کام کا تو یہ دقت نہیں ہے۔

"پھر اور کوئی گاڑی ہوگی۔"

"ہاں اور کوئی گاڑی ہوگی مگر بڑی دیر لگائی۔"

"اصل میں پانچبر کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ خون کی چال چلتی ہے اور قدم قدم پر نکلتی ہے۔"

پانچبر فرین کی خرابیاں اس اب پر کل رہی تھیں۔ سارا ہوتے وقت تو وہ انجین کشی کو نظر آ رہی تھی۔ پلٹ فارم پر کتہا جھم تھا کتنی دھم دھم کے ساتھ وہ گاڑی میں ٹھس رہے تھے۔ اور سینٹ لینے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پھیل رہے تھے ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے جو اندر داخل ہو گئے تھے۔ ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے جو باہر دو گئے تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل ہو جانے والوں نے کتنی بھارتی سے اپنے ذہن کے دروازے بند کر کے اور بعد میں آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے کھٹکوائے تھے اور سامنے آنے والوں کو دیکھ دیتے ہوئے بسزوں اور کسوں کو پھٹا دیتے ہوئے شست کی کشاں میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کتنی دھیمے کا شتی کے بعد کبھی بیٹھنے کی اور کبھی کھل کھڑا ہونے کی جگہ مسمانی۔ پھر جب گاڑی چل تو ہم سارا ہوا جانے والوں نے اپنے آپ کو کتا خوش نصیب اور پیچھے رہ جانے والوں کو کتا بد نصیب جانتا تھا۔ پھر بچا یک پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہمارے یہاں کتنی بھاری کا جذبہ ہوا گیا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ دوڑتے دوڑتے آ کر کوئی جینڈل پکڑ کے ٹک گیا تو کسی نہ کسی نے جینڈی سے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کی راہ دے دی۔ پھر چلتی ہوئی گاڑی سے ہم نے ایک گونا گویاں کے ساتھ اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ پلٹ فارم پر کھڑے رہ جانے والے مسافر کتنے بے آسرا اور کتنے قابلِ رحم نظر آ رہے تھے۔

اب یہاں اٹھانوے لگا تھا۔ اس گاڑی کے مسافر ہونے کی بنا پر ہم اپنے آپ کو کتاب بے آسرا کتا قابلِ رحم سمجھ رہے تھے اور وہ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے؟ اچھے رہے۔ ہوا لوگ جس گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے رہ گئے۔

"میری سینٹ تو جہاز میں کس تھی۔" برف کس دھان بولا "لیکن پروگرام میں تہ لٹی کی وجہ سے مجھے اپنی سینٹ کیسل کرانی پڑی۔ اس کے بعد کسی ملاصاف میں کوئی سینٹ نہیں ملی۔ سو چاکر فرین بکڑی جائے۔ تیرا کام سو پر کسی میں سینٹ نہیں ملی۔ آفر کو پانچبر میں بیٹھنا

پڑا۔"

ایک دفعہ پھر مسافر فرین کی کے ساتھ اندر آئے اور اپنی اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئے۔ اصل میں ابھی ابھی انجین نے سیٹی دے دی تھی۔

"گاڑی اب چلتے لگی ہے" کہنے والے کے لیے سب دلی دلی خوشی کا رنگ شامل تھا۔

"واقعی؟"

"ہاں بس پھٹے والی سہانجی نے سیٹی دے دی ہے۔"

"اٹھ تیرا کھر ہے۔"

"کسی لڑکے نے جھانک کر باہر دیکھا" اسی دیکھو۔"

"کیوں کیا بات ہے۔"

"دھواں" اس نے اگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے بھی باہر جھانکا۔ واقعی انجین نے اچانک کتنے زور شور سے دھواں اٹھنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹی ہی سے نہیں اس دھوئیں سے بھی شاید مسافروں نے یہ اشارہ لیا تھا کہ بس اب گاڑی چل پڑے گی۔ انجین کے منہ سے ایسا کالا دھواں نکل رہا تھا کہ گنگا تھا کوئی دیر جاتی ہے کہ سارا جنگل کالا ہو جائے گا واقعی گاڑی کا انجین جب دھواں اٹھتا ہے تو اس کی بات اور ہوتی ہے فضا میں کالوس کی ایک کثیر کھینچ اور دھٹی چلی جاتی ہے کہ جب کھڑا ہوا انجین دھواں اٹھتا ہے تو فضا کی پاکیزگی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ انجین نے دھواں اٹھتے اٹھتے ایک دفعہ پھر سیٹی دے دی تھی کہ ہمارے جنگل میں کوئی کئی ہم مسافر ان کے دل جیسے سیٹی کی آواز سے گر جائے ہوں وہ جو ایک بڑی دیر چھائی ہوئی تھی وہ کافر ہو گئی۔ ہم سب ہی مسخرا اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ لگہ بھگ اچانک گاڑی میں حرکت میں آئے والی ہے۔

پھینے رہے پھینے رہے۔ یہاں نے بالکل پہلے کی طرح ایک ہلکی سی جنبش کی تھی اور اس سے ایک تکلیف بھری آواز بھی پیدا ہوئی تھی جیسے یہاں کو گردش کرنے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ مگر پھر وہی سکوت۔ اور اب تو دھوئیں کا زور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ کالے سے بھورا ہوا پھر بالکل ہی صاف ہو گیا۔

جب گاڑی کسی طور حرکت میں نہ آئی تو پھر وہی چیز اسی۔ بڑے سماں نے پور ہو کر پھر اظہار افشا اور پڑھی ہوئی خبروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے پور گاڑی میں چپ پھر کھلیا اور صورت نے اس طرح تپتی دیر دیر اور لا پر وہاں سے ٹھس اور پراگھاتی کہ دم بھر کے

لیے تو جیت سے اور کاہرا بھرا منتظر بھی لڑا پاں ہو گیا۔

”گازی آج نہیں چلے گی۔“ کسی نے بیزار ہو کر کہا۔

”اسی گاڑی میں چلے گی“ کس لڑکے نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

”چلے گی جیے۔“

”کب چلے گی؟“

”بس تھوڑی دیر میں چلے گی۔“

کس لڑکے نے بہا متاری سے ہاں کا جواب دیا اور پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

”شام ہو رہی ہے۔“ ایک مسافر نے باہر بھاگتے ہوئے کہا۔

ہاں واقعی۔ دو سو ستھریں سپید اور کھیت پر ابھی تھوڑی دیر پہلے تک صوب میں چمک رہے تھے اب چھاؤں میں آ چکے تھے

اور چھاؤں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جیسے وہاں کی چمکتی چار دیو۔

”رات کبھی ہی جنگل میں نہ گزارنی پڑ جائے۔“

”اس جنگل کا راستہ تو دن میں بھی محفوظ نہیں۔ رات گزارنی پڑی تو.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ بحران کے کشمکش بھرے لہجہ

نے سب کو کھرا کر ڈال دیا۔

بڑے میاں نے انہار سے نظریں اٹھا کر کہنے والے کی صورت دیکھی۔ پھر انہار ایک طرف ڈال کر مدعی منہ میں کوئی آیت

پڑھی۔ لا الہ الا انت سبحانک..... چپ ہوئے۔ پھر انہوں نے بولنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر گھیسے اپنے خطاب کے لیے چلا۔

”جیسے تم کہاں جا رہے ہو؟“

”یہ سوال ہے گل ہے۔“

انہوں نے غور سے میری صورت دیکھی۔ ”بے گل کیسے ہے۔“

”ہم میں سے کس کہاں جاتا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں سے کب نکل رہے ہیں۔“

”نہ نکل رہے ہیں یا نہیں۔ کسی قریب پیٹھے ہوئے نے ٹکرا دیا۔“

اسی گھڑی گاڑا اپنی سلیپر وادی میں گزرتا نظر آیا۔ ایک مسافر اسے دیکھ کر بھارتی سے اٹھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد

واپس آ گیا۔ سب نے اسے تجسس نظروں سے دیکھا۔

”یہ گاڑا تھا؟“

”ہاں۔“

”کیا کہتا ہے۔ گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟“

”آگے گز رہا ہے۔“

”بھرا خیال ہے۔“ بریل کس وہاں بولا۔ ”آگے کوئی حادثہ ہوا ہے۔ نہیں تو گاڑی اتنی دیر نہیں رک کئی تھی۔“

”ہو تو نہیں ہے۔ ہو جاتا۔“

”اچھا؟“

”ہاں اور اسی گاڑی کے ساتھ ہو جاتا۔ دو تہرہ دقت پڑ چکا تھا۔“

”اچھا؟ کیا بات تھی؟“

”آگے بڑھی اکھڑی ہوئی ہے۔“

”بھرتو پی گئے۔“

”ہاں یہاں سے نکل جا رہے ہیں۔“

ہاں واقعی میں نے سوچا پہلے یہاں سے تو نہیں اور اسی کے ساتھ مجھے پھر اس گھڑی کا خیال آیا جب ہم اس گاڑی میں سوار

ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ کس طرح ایک احساس تحفظ کے ساتھ ان پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم

پر ترس کھا رہے۔ خوش فہمی اور بد فہمی کا کتنی جلدی آپس میں تھار ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بد نصیب بن

چکے ہیں۔ اچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک واقعی بد فہمی سے گزر کر خوش قسمت بن گئے اور ہم..... ہاں اور

ہم۔ میں نے ارگرد نظر ڈالی۔ شام کی چھاؤں باہر سے رینگ رینگ کر اندر آ گئی تھی۔ ساتھ ہی ادا بھی جو شام کی چھاؤں کی ہزاروں

ہے۔ ابے میں ابھی لاکھوں میں چلی تھیں۔ اپنی اپنی نشست پہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے سب آدمی سامنے دکھائی پڑ

رہے تھے۔



جب سالگاہ ہے۔ بس اس عیال کے ساتھ اس نے فنی کوٹھی کر ڈیا۔

کلی کے بل کی ادائیگی کے لئے ایک چھوٹا تو کاؤنٹر کے سامنے ایک پوری قمار کو پڑا دو بجی قمار میں لگ گیا۔ قمار میں کھڑا ہا ہور ہوتا رہا۔ جیسے تیسے باری آئی۔

بے سبب

ہی نے اس کی طرف غور سے دیکھا "کس بات پر ہنس رہے ہو؟"

"میں ہنس رہا ہوں؟ فکرتو۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لوٹنسی ہی نہیں رہے ہو باجیس کو کل جاری ہیں۔" "نئی ٹھہری۔" "کوئی یاد رہا ہے۔"

"یاد کوں آ؟" وہ ہنسنے لگا۔

کئی مرتبہ اس نے کوشش کی کہ بیوی اور اصرار ہو جائے تو دل کو دل کر ہٹا جائے مگر وہ اس سے کسی نہیں ہو رہی تھی ہنسنے کے برتن باور ہی خانے میں۔ کئے اور فرمایا وہاں آگئی۔ رفتہ رفتہ اسے چھین آگیا کہ گھر میں اسے ہنسنے کی آزادی میسر نہیں آ سکتی۔ پھر کہاں جایا جائے۔ گھر کی طرف سے ماہیں ہو کر اس نے باہر تصور دوڑا اور اپنے مقامات کو دھیان میں لایا جہاں اطمینان سے ہنسنے کے امکانات تھے۔ اصل میں آج صبح ہی سے اس کا ہنسنے کوئی چادر ہوا تھا۔ فخر آج اسے دیر سے جانا تھا۔ عیال بھی تھا کہ گھر میں اطمینان سے بیٹھیں گے اور نہیں گے۔ جب گھر کے اندر ہنسنے کے امکانات اس نے مسدود کیے تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں تو فخر آج دیر سے جانا تھا۔" بیوی نے ٹوکا۔

"ہاں مگر ایک دو کام باہر کے ہیں۔ سوچا کہ انہیں نہ لایا جائے۔ پھر دوسرے دوسری دفتر چلا جاؤں گا۔"

"پارہے ہو تو کل بھی ادا کر دو۔ پرسوں آخری چار بجے ہے۔" یہ کہتے کہتے بیوی بھی اٹھ رہی اور دیکھ آ کر کلک کلک اور رقم اس کے حوالے کر دی۔

جب وہ ہنسنے کا موقع ہی کو پھر ایک کام یاد آ گیا۔ "امی میں نے کہا کہ خالوں کو فنی آزار بھی تو بھیجا تھا۔ بل ادا کر دو تو ہیں کہیں ڈاک خانہ میں ملے گی۔ آزار بھی کر دیا۔" اور جلدی سے سو کاؤنٹر اندر سے لاکر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

گھر سے نکل کر اس نے اپنے آپ کو آزار محسوس کیا۔ اس میں اطمینان سے بیٹھ سکتا ہوں۔ سکول سٹارٹ کرتے ہوئے فنی اس کے ہونٹوں پر کھینچنے لگی تھی کہ بھٹا خیال آیا کہ لوگ اسے سکول پر ہنسنے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آدھی سکول پر بیٹھا اور ہنس رہا ہو تو کتنا

بل ادا کر کے ڈاک خانے پہنچے۔ یعنی آزار فارم نے کراسے پر کیا۔ فارم پر کرتے کرتے کاؤنٹر پر اور کئی فنی آزار دیکھنے والے آ کھڑے ہوئے۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا دوسرے سے پیچھے تھا۔ سب سے بعد میں اس کی باری آئی۔

ایک ادا کر کے ڈاک خانے نے اسے بہت پروردیا تھا۔ سوچا کہ کسی لحظے کے گوشے میں چھپ کر چائے پی جائے کہ طبیعت بحال ہو۔ قریب ہی رستورن تھا۔ اس میں داخل ہو گیا۔ فضا پانی چا گرم چائے کا کھونٹ چڑھا دیا تب کہیں جا کر طبیعت بحال ہوئی۔ طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہنسنے کی خواہش عموماً کوئی محروم آدل میں خیال آیا کہ اس پاس کی میز سے کسی نے اسے ہنسنے دیکھا تو کیا سوچے گا یہی کہ آدھی دہائی چل گیا ہے۔ اس نے ادا کر کے دفتر والی۔ میز پر بھری ہوئی تھیں۔ یہ کچھ کاؤنٹ تھا۔ سب کمانے میں مصروف تھے کسی چہرے پر کوئی فنی نہیں تھی۔ مجھے ہنسنے کی فرصت ہے اس نے سوچا مگر میں اکیلا ہوں۔

آدھی اکیلا ہوا اور ہنس رہا ہو تو خواہ مخواہ ایک ہوتا ہے کہ سبک گیا ہے تو ہنسنے کے لئے دوسرے کی شرکت ضروری ہے۔ یہ جب طرح کی پابندی ہے اس نے چکر سوچا۔

سوچا چڑھتا چاہیے۔ ہنسنے کے لئے دفتر سے بھڑکائی جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہاں ہنسنے میں شرکت کرنے والے آسانی سے میرا جاتے ہیں۔ دفتر میں ان دنوں بھی کچھ ہوتا ہے۔ فاکوں کے ڈمیر لگتے رہتے ہیں۔ دفتری وقت باتوں میں گزرتا ہے کبھی سیاسی مسائل پر بحث کبھی لطیف بازی۔ فاروقی کو کتنے لطیفے یاد ہیں۔ اسے بس بھانا چاہیے شروع ہو جائے گا۔ مگر دفتر میں پہنچ کر اس نے اور ہی فضا دیکھی۔ مسئلہ یہ نہ کہ بحث تھا کہ فاروقی کی سنیاری کو نظر انداز کر کے علی احمد کو جو فاروقی سے جو تیز تھا اٹھ کر بیٹھ دے دیا گیا تھا۔ فاروقی کا سوا طر آف تھا۔

ایک بی بی کے ساتھ وہ دفتر سے گھر کی طرف چلا۔ بس اسی بی بی کے عالم میں اس کے ذہن میں ایک سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخر وہ ہنسنے کیوں چاہتا ہے۔ اس آفریں ہنسنے کیوں چاہتا ہوں۔ لیکن کیا ہنسنے کے لئے کسی سبب کا ہونا ضروری ہے۔ اسے یاد آیا کہ صبح جب اس کی بی بی نے اس سے یہ چھٹا تھا کہ کیوں ہنس رہے ہو اسے اس سوال سے کتنی گھبراہٹ ہوئی تھی۔ زندگی کے ہر مرحلے میں ہر فعل پر یہ سوال کھڑا کر کے کیوں کر رہے ہو کتنی فضول بات ہے۔ آدھی کو کچھ کام ایسے بھی تو کرنے چاہئیں جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔ تو مجھے اپنے آپ سے یہ نہیں چھٹا چاہیے کہ میں کیوں ہنسنے چاہتا ہوں بس ہنسنے چاہتا ہوں محض اور صرف ہنسنے کی وجہ کے بغیر سب

اس نے اپنے اس استدلال سے اپنے آپ کو قائل کر لیا تھا۔ مگر دل کے اندر ایک چرچا دوسروں کو وہ کیسے قائل کرے گا۔ دوسرے بچے اور وہ نے دونوں کی وجہ پر چیتے ہیں تو دوسروں کو وہ کس طرح قائل کرے گا۔ دوسروں کو قائل کرنے کی تدبیر سوچتے سوچتے اس نے ارد گرد کا تصور کیا اور ہر طرف اسے وہ جگہ نظر آیا جس پر صرف چٹائی جاسکتا ہے۔ بچے کا ارد گرد اتنا سامان ہوتا ہوئے کوئی کیوں بچے کو کھائے کھائے نہیں رہے اور کیوں؟ بتانے کی ضرورت نہیں آئے کہ ہم کس وجہ سے نہیں رہے ہیں۔ اسے تعجب ہوا کہ کئی زمانہ بچنے کا اتنا افر سامان موجود ہے پھر بھی ہم کتنا کم بخت ہیں جیسے ہمارے نہ بچنے سے صورت حال کی مستحکم خیر ہی جانی رہے گی۔

مگر کچھ کس اس نے حالات کو بہت سا دکھایا۔ اب خوشی سے بالکل مختلف تھا۔ یہی یاد رہتی خانہ میں مصروف تھی۔ رات کے کھانے کی بات یا خاصہ دیر سے چڑھائی گئی تھی۔ اسے اپنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اس کے پاس آکر غصے کی اس جہائی کو اس نے بہت نصیحت جانا۔ جہائی بھی کتنی نصیحت ہوتی ہے۔ ایسے میں کوئی دیکھنے والا نہ ہوگا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہی کتنا آزاد محسوس کرتا ہے۔ اس نے یوں ہی ریڑھ آں کر دیا۔ سوچ کھانے لگا کبھی ایک اسٹیشن لگا یا کبھی دوسرا اسٹیشن کوئی خاص اسٹیشن لگا اور سزا مقصود نہیں تھا وہ تو بس تفریحاً سوچ کھانا رہا تھا۔ ایک اسٹیشن سے ڈرامہ ہوا رہا تھا۔ ڈرامہ کامیابی کی قسم سے تھا۔ کچھ دیر اس نے ڈرامہ سنا اور خوش ہوا۔ پھر اس نے سوچ کھانا دوسرا اسٹیشن لگ گیا۔ یہاں بچوں کی کہانی ہو رہی تھی۔ سننے والے بچے کچھ میں ٹکسٹا کر بھٹتے۔ پھر اس نے سوچ کھانا دیا۔ ایک اور اسٹیشن لگ گیا۔ کچھ گانے بھانے گانے پر دگر ہم ہوا رہا تھا۔ گانے بھانے والی کوئی ترک نہیں تھی۔ جو اسٹیشن بھی لگ جاتا کبھی اسے احساس ہوتا کہ وہاں سے خوشی بھر رہی ہے۔ دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ "ہاں دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں۔" وہ بڑبڑایا اور اس کو بکھیرا بغیر کسی سبب کے۔



سستی

باہر جین برس رہا تھا اندر جس بہت تھا۔ جس سے پریشان ہو کر کسی کسی نے سر باہر نکالا پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔ "بارش کچھ کم ہوئی؟"

"بالکل کم نہیں ہوئی۔ اسی شور کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی ہے۔ یہ بارش ہے یا کیا سہ ہے؟"

"اندر کے جس سے تو بہر حال بہر صورت ہے۔"

"کوئی بہر صورت نہیں۔ اندر جس باہر بارش۔ آدمی آخر کہاں جاسے۔"

"سب کچھ ڈوب گیا۔ اب آٹھ بارش کیوں ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"ہم جو باقی رو گئے ہیں۔"

"ہاں بس یہی رو گئے ہیں۔ مگر ہم ہیں کتنے اٹھیں پر گن لو۔ باقی تو چند پر بند ہی ہیں۔"

"ہاں باقی تو چند پر بند ہی ہیں۔ شاید اس لیے بھی جس بہت ہو گیا ہے جانوروں کے درمیان سانس لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پتہ

نہیں کہ کب تک ہم اس طور جانوروں کے درمیان بسر کرتے رہیں گے۔"

"ہاں پتہ نہیں کہ کب۔ بارش تو روکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ کتنے دن گزر گئے کہ اسی ایک رفتار سے ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"شروع کس دن ہوئی تھی؟"

"کس دن۔ ہاں کم از کم حساب تو کرتا چاہیے کہ کس دن شروع ہوئی تھی اور اب کتنے دن ہو گئے۔ سب نے اپنے اپنے طور پر یاد

کیا۔ پر کسی کو یاد نہ آیا کہ وہ کون سا دن تھا اور کوئی تاریخ تھی جب رستا شروع ہوا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب کچھ اندازہ نہیں کہ کتنے دن سے سڑ میں ہیں۔"

کتنے دن سے ہم سڑ میں ہیں۔ سب سڑ میں چلے گئے۔ کتنے دن سے کتنے برس سے کتنی صدیوں سے بارش اور سڑ میں بھی ہوتا

ہے۔ لگا ہزار برس سے تو لگتا ہے کہ برس برس سے برس رہا ہے اور برس برس برس رہے گا۔ سڑ کے کچھ کوئی چاند آئے تو بچوں محسوس ہوتا ہے

جہنم سے سفر میں ہیں۔

”بہر حال جس دن بارش شروع ہوئی ہے اسی دن ہم گھروں سے نکلے تھے۔ سو اگر ہم میں سے کسی کو یہ یاد ہو کہ ہم نے کسی روز اپنے گھروں کو چھوڑا تھا تو.....“

”گھروں کو؟“

گھروں کو چھوڑنے کے بعد یہ پیدا سوچا تھا کہ گھروں کا نام کسی کے لب پہ آیا تھا تو ہمارے گھر بھی تھے یہ سوچی کے وہ حیران ہوئے اور چھوڑے ہوئے گھر واپس آنے کے تصور میں ہیں ابھرے جیسے ابھی ابھی وہ انہیں چھوڑ کر نکلے ہیں۔

”کاش وہ ابھی میرے ساتھ سوار ہو جاتی۔ جانے اب کن پانچوں میں گھر کی ہوگی۔“

”وہ کون تھی؟“

”وہ جو سینے سے اترتے ہوئے سیر میوں کے بیچ مجھ سے ٹکرائی تھی۔“ اور وہ سارا سطر اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔ وہ برتی تھی آنکھوں والی کہ اپنے لبہ کے اندر وہ کچے پھل لیے بھرتی تھی اور جب ان سیر میوں سے اترتے ہوئے اس نے اسے تھما تو کھا کر دگر دم حو کئے جانے والی کورتیاں اس کی میٹوں میں آ گئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کی گرفت سے آزاد تھی اور وحشی برتی کی مثال قلائیں بھرتی بھاگی ملی جاری تھی۔ دیر بعد اس کے دشت اس برتی کی کم ہوتی ملی گئی تھی کہ بھری وہ پہر میں نیلے کے پیچھے گھبراہٹ سے وہ اس کے گرم کمر پر بھڑے دستی ملی گئی۔

زینے زینتیاں آ آ گئیں نیڑی نیڑی رالٹا نیلے پھلوں سے لدے پردوں سے بھرے اونچے پلک ایک دم سے انہیں کتنا کچھ یاد آ گیا تھا۔

”ان گھروں کو کیا یاد کرنا چڑا دے مجھے اور بہہ گئے۔“

ہاں یہ تو انہیں ابھی تک خیال آیا ہی نہیں تھا کہ جو پانی پھاتوں کی چوٹیوں سے گزر رہا ہے اس نے ان کے گھروں کو کہاں چھوڑا ہو گا۔

”گھر ہم ان گھروں کو کیسے بھول جائیں گے کہ ہم نے ان گھروں میں بیٹھ کر اترنے والی دھنوں کے لیے گیت گائے اور گزرنے والوں کے لیے گرہ کیا۔“

جب سب آنکھیں بند پا گئیں۔ پھر ان سب نے مل کر اپنے گھروں کو یاد کیا اور دوڑے۔ ”میں بڑا دن گھروں کی برادری مقدور ہو

بھلی تھی۔“

”وہ کیسے؟“

جب کھانا مکمل دوزانو ہو گیا اور یوں گویا ہوا کہ مسلسل وہ یہ مہربت کا دار کئے ہوئے تھے دیکھو کہ میں کن کن پر شور و سنہرے دیں سے گزر کر اس انجم میں پہنچا جہاں اتنا جہنم استراحت کرتا تھا۔ میں نے فریادی کر اے اتنا جہنم میں سے اتنا تھا کہ حرکت میں برکت ہے اور سطر وسط قطر ہے پر مجھ اور باندہ راہ نے حرکت کو بے برکت پانچا اور سطر کو حاصل مانا جب کہ تو حیات جاودانی کے حرے لوتا ہے اور اس بہشت بنیاد میں ہم آرام کرتا ہے۔ لیکن کن اتنا جہنم نے تال کیا۔ پھر میں اب کشا ہوا کہ اسے تیر و بخت میں دیکھتا ہوں کہ رنج سفر نے تجھے بلکان کر دیا ہے اور عالم نے تیرے اندر گھر کر دیا ہے سو تو گھڑی بھر کے لیے دم لے پھر صوبہ ہو پھلا اور کوش ہوش سے سن کر کیے گھر میں نے حرکت میں برکت دیکھی اور سطر کو وسط قطر مانا اور اس راہ حیات جاوداں پائی۔ میں نے اپنا گھر اٹھا کر پھر بخشی دیا۔ اس پر میں حیران ہوا میں بولا کہ اسے بزرگ ہے میں کیا سدا ہوں۔ نہیں کوئی اپنے ہاتھوں سے بھی اپنا گھر ڈھاتا ہے۔ اتنا جہنم ہے کن کن افسردہ ہوا۔ پھر بولا کہ میرے خداوند کی مرضی یہی تھی۔ وہ میرے خواب میں آیا اور خبر دی کہ اہلیلی نصیبے میں ہے کہ زمین پر شور بہت ہو گیا ہے کہ یہ شورا سے سوئے نہیں دیتا۔ سو اے اتنا جہنم تیری غایت اس میں ہے کہ اپنا گھر ڈھادے اور بخشی فقیر کو تو اسے کھانا مکمل گھر اپنا میں نے خداوند کی مرضی سے اٹھا کر بخشی دیا۔

جب انہوں نے سہاوار یاد کیا کہ ہوا کیا تھا۔ ہوا میں آدھیوں سے بھر گئی آدھیوں سے خیر ظلم سے خداوند نے تو بس آوی کو پیدا کیا تھا۔ پر اس نے آگے دیکھا پیدا کر ڈالیں اور خداوند کے بیٹوں نے ان بیٹیوں کو خوبصورت پانچا اور اپنی جوروں میں بنا لیا اور ان بیٹیوں نے جوروں میں کن کن بیٹیاں جنیں کہ حرے خدا کے بیٹے ان پر گھمے اور انہیں جوروں میں بنا کر اپنے گھروں میں لوٹے بس اس طرز میں آدھیوں سے بھرتی ملی گئی۔ آدھیوں سے اور ظلم سے پھر ایسا ہوا کہ خداوند پچھتا کر آگیا اور پھر میں بولا کہ میں نے آدھ زاد کو بھرا دیا۔ سو میں اب انسان کو جنسے میں نے خلق کیا تھا تو انہوں کو کہہ کر زمین بہت گھڑی ہے اور ظلم سے بھر گئی ہے۔

پھر انہیں بچے ہوؤں کے بیچ ایک نیک بندہ تھا کہ خداوند کے ساتھ چلتا تھا اور خداوند نے اس سے کہا کہ اے لک کے بیٹے میں تجھے یہاں کا سو تو عیسا کر کہ ایک بخشی بنا دو کہ جب طوفان اٹھے تو ہر ذی روح کے ایک جڑے کو اپنے ساتھ لے اور بخشی میں چھ جاو اس بندے سے دیکھا ہی کیا۔ جیسے اس کے خداوند نے اس سے کہا تھا۔

پر وہ بندہ ابھی جوروں کا تھا اور اس جوروں نے بیٹے بیٹے جنکوں نے بڑے ہو کر خوبصورت بیٹیوں کا اپنی جوروں بنا لیا اور وہ شور و برکو

کشتی تارتے دیکھتی تو غصہ کرتی اور چلیوں کو قلعہ کر کے کشتی کو تھما رہے ہاپ نے یہ کیا کھڑا گ پھیلا رکھا ہے کہ دن بھر اور رات بھر گھڑیاں کاٹ کاٹ کے کچھ تار جاتا ہے۔

یہ طے سن ملک کے بیٹے نوح نے آ کر خزانہ کھولی اور کہا کہ اسے میری زندگی کی شریک ڈراں دن سے کہ تیرا گرم بندہ دھنڈا ہو جائے اور تو آ کر مجھے طوفان کی خبر دے اور بھروسہ سنوئی یہ کچھ بھوک رہ گئے کہ چلی بڑی ہو گئی ہے اور ہاں چھوڑ رہ گیا ہے۔ کل ہی تو اٹھان کرتے تھے ان کے چلو میں یہ چلی آگئی تھی کہ اس سے پچھلے اگلی کے ساتھ تھی۔ وہ اسے پیچھے لگے تھے کہ اس نے دہائی دی کہ پر بھوشانی۔ تیرے ساتھ اسے شرن لینے آئی ہوں کہ میں چھوٹی چلی ہوں اور غریب اور بڑی چلیوں کے کچھ جنس رو سکتی کہ بڑی چلی چھوٹی چلی کو کھاتا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے شرن میں لے لیا اور ایک کونڈے میں جل بھر کے اسے اس میں ڈال دیا۔ یہ اس دو کچرہ ہے تھے کہ کونڈا چھوڑا رہ گیا ہے اور چلی بڑی ہو گئی ہے۔

منوئی نے چلی کو کونڈے سے نکال کے کھڑے میں ڈال دیا اور پانی اس میں بھر دیا۔ پراگھن اور بھروسے جب منوئی چو جا کے لیے اٹھے تو دیکھا کہ کھڑا چھوڑا رہ گیا ہے اور چلی بڑی ہو گئی ہے کہ اس کی کھڑے سے باہر نکل ہوئی ہے اب انہیں اور بھی اچھ جہا کہ کھسکی چلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ کھڑے میں نہیں سہائی۔ چلی نے دہائی دی کہ پر بھوک پکا کرو۔ کھڑے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

منوئی کی کہنیا کے باہر ایک جل کھڑا تھا۔ انہوں نے چلی کو کھڑے سے نکال کے جل کھڑے میں ڈال دیا اور چنت ہو گئے۔ پھر اگلے دن انہیں چنتا لگ گئی۔ جل کھڑا چھوڑا رہ گیا تھا چلی بڑی ہو گئی تھی کہ پوچھی اس کی جل کھڑے سے باہر نکل ہوئی تھی۔ چلی نے ہمار دہائی دی کہ پر بھرتے نے مجھے اپنے شرن میں لیا ہے پر مجھے تھما رہے شرن میں بچن نہیں ملا۔ منوئی نے یہ سن کے چلی کو جل کھڑے سے نکالا اور گر سے باہر نکالیا میں کھکا رہا۔ کہا کہ سب تو نکلیا میں تیرا اور بچن کر۔

منوئی چلی کو نکلیا میں چھوڑ کے گھرا بیٹے آئے جیسے سرے بڑا بوجھ اتار کے آئے ہیں۔ اس رات دو بچن سے سوئے۔ پر جب تر کے میں اس کی آنکھ کھلی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چلی کی پوچھی کیا ہے نکل لکھی ہوئے ہوئے ان کے آنکھ میں آن بھیلی تھی۔ وہ جھٹ پٹ اٹھ گیا ہے گئے۔ کہا دیکھا کہ نکلیا چھوٹی رہ گئی ہے۔ چلی بڑی ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی کہ نکلیا کے اندر تو بس اس کا منہ تھا۔ باقی دھڑا اور پوچھی سب باہر۔ چلی بوئی کہ ہے پر بھروسہ تھما رہے شرن میں تیرے اور سانس لینے کو ترستی ہوں۔

منوئی نے چلی کو نکلیا سے نکالا کہ پر لا اور اور چلے گا نہ کی کی اور وہاں جا کے انہوں نے اسے غریب میں چھوڑا اور کہا کہ ہے دہائی

چھلپا میں نے تجھے کھکھاسا کی گود میں دیا۔ سہا کی گود میں چاہے سہا چاہے پھیل۔ پر وہ ابھی یہ کہتے تھے کہ چلی پیسٹ لگی۔ اتنی چلی کی گھکھاسا کی گود چھوٹی رہ گئی۔ چلی بڑی ہو گئی۔

منوئی یہ کچھ بکا بکا رہ گئے۔ بوئے اس کی تو زبانی چلی ہے کہ چلی ہی جاری ہے پیسٹ کا نیم ہے کہ چنی چارو دیکھے اسے پاؤں پھیلائے۔ پر تیرے چمن ہے چن کہ چنتا جل دیکھتی ہے اس سے زیادہ بھیل جاتی ہے۔ اچھا اب تیرا پاپا نے بھی ہے کہ میں تجھے ساگر کے صحنہ کر دوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے چلی کو کھکھاسا کی گود سے لیا اور کندھے سے پلا اور سار کی اور۔

سار کی اور جاتے ہوئے منوئی کو دھیان کی لہر بہا کے پیسے سے میں نے کئی جب دشمنی ہونے کے روپ میں پر گھٹ ہوئے تھے۔ انہوں نے اس ڈشٹ راہ سے تین ڈگ دھرتی مانگی تھی۔ اس سوکھ نے سوچا کہ ہونے کے تین ڈگوں میں کتنی دھرتی جاتی ہے۔ مانگ مان لو۔ یہ سوچ اس نے مانگ مان لی۔ پر دشمنی ایک دم سے ہونے سے دوج بن گئے۔ انہوں نے تین ڈگ ایسے بھرے کہ دھرتی اور آکاش دونوں تین ڈگوں میں سیٹ لیے۔ اس دھیان نے منوئی کو چکا دیا۔ ایک صبر سہرے کے ساتھ انہوں نے چلی کو دیکھا۔ پر ترنت دھیان کی اک اور راہ آئی۔ جی میں کہا کہ اس سے تو دھرتی راکھسوں کے چنگل میں قحی سودھن مہاراج نے اس پر کارجل دیا اور دھرتی کو ان کے چنگل سے نکالا۔ آج کے ڈشٹ ایسے کونے بڑے راکھس ہیں کہ دشمن مہاراج ایسا سا ک بھری گئے۔ انہیں وہ چاہتے تو ابھی چھتیاں کے ساتھ مل ڈالیں۔

بس یہی سوچتے سوچتے منوئی ساگر کنارے پہنچ گئے۔ چلی کو ساگر میں دھکلا اور کہا کہ اب تو میرا چھوڑا اس دھال ساگر میں جتنا سن چاہے اتنا بھیل جا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ چلی پیسٹ لگی۔ پیسٹ پیسٹ پورے ساگر پر چھا گئی۔

منوئی نے ایک جگہ کے ساتھ یہ کچھ دیکھا۔ پھر شر دھا سے ان کا سر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کے آنکھیں موند کے کھڑے ہو گئے اور گئے کہنے پر بھوشانی۔ آواز آئی کہ ہے سو دھرتی راہیوں کے ہاتھوں اٹھاتے ہے پر تجھے شانتی ملے گی۔ سو تو ڈھکا۔ جب ساگر مٹنے سے اور دھرتی ڈوبنے تو چھتیاں کھنڈوں میں سے ایک ایک جڑا تک لے اور ڈھک دیا۔

منوئی یں بوئے کہ ہے پر بھو جب ساگر مٹنے سے گا تو میرے ہاتھوں کی بنا کی ہوئی ہوئی یاد دہائی کی بات ہے۔ آواز آئی کہ ہے سو تو اسے میری سوچ کے ہال سے ہاتھ دیکھ۔ بوئے کہ ہاتھوں کا ہے۔ میرے پاس کوئی دہی نہیں ہے۔ ترنت ایک سانپ دہی سان لہروں میں لہرایا۔ ہے سو یہ دہی دہی اس سے ہاتھ اندھ لہجے۔

جب زوجہ حضرت نوح کی حضرت کے پاس پہنچی۔ اس حال سے کہ اس کے ہاتھ آٹے میں سے ہوئے تھے اور ہوش اڑے

کی دیواریں اس کی چوہ جاگیں اور چھت اس کی آن پڑے تو یہاں سے نکل اور کشتی میں بیٹھ کر آ زمین و آسمان کے بیچ وہی ایک پناہ گاہ ہے۔"

پڑوہ جان حضرت کی ڈھیت ہو کے یہ بولی کہ اگر میرا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو پھر مجھے کہاں پناہ ملے گی۔

جب حضرت اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ اسے مرے بیٹے قہاری ہاں تو زمین بکڑی ہے اور ہلکا ہونے والوں میں شامل ہوگئی ہے تم باپ کی سنو اور جلد کشتی میں بیٹھ جاؤ سہارا قائم بھی کافر مانوں میں شمار کئے جاؤ اور ہلاکت کے گھبرے میں آ جاؤ۔ یہ سن سب بیٹے کشتی میں سوار ہوئے سوائے بڑے بیٹے کھان کے کہ اس نے ماں کی راہ کا پناہ پا اور باپ سے کہا کہ اسے مرے باپ میں کیونکر اس گھر کو جس میں میری نال گوی ہے چھوڑ کر اور کیونکر اس مٹی سے جس نے مجھے دس اور جس دیا ہے منہ موڑ کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤں جس میں تو نے ہر رنگ کا جتا اور جمع کر لیا ہے۔

حضرت نے بیٹے کی بات سن کر کہا کہ اسے مرے بیٹے دیکھ یہ قبر کا دن ہے سو انسان اور جان سب ایک کشتی میں سوار ہیں کہ طوفان بے امان ہے اور نہ کی کی حفاظت اس کشتی کے سوا کون کس نہیں ہے۔

دیکھا لاکا اسے مرے باپ تھامی کی موت کھم کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے اور مگر کے اندر پانی میں فرق ہو جاتا اچھا ہے۔ یہ نسبت اس کے کرا دہی جانوں میں جانوروں کے درمیان بسر کرے۔

جب حضرت نوح اپنی بی بی سے اور اپنے بیٹے سے مایوس ہوئے کہ انہوں نے زمین بکڑی اور کافرانوں میں شمار ہوئے اور جب کشتی رواں ہوئی اور حضرت نے کہ سلام ہوا ان پر دعا مارا کہ بعد یاس اس گھر کی جانب دیکھا جسے وہ چوسو برس تک رہا جس کر چھوڑ رہے تھے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے باپ کا بتایا ہوا بڑے چھانک والا وہ مگر کھل تک شاد آباد تھا اب امنی کی موجوں کے بیچ غالی ڈھنڈا چڑا تھا اور ان کی زوجہ نے اور ان کے بیٹے نے برستے آسمان تلے چھت چ پناہ لی ہوئی تھی پھر یوں ہوا کہ وہ مگر آ نکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور پانی کا زور بڑھتا چلا گیا۔

میدانے پر سا بھیجے آسمان کے سب دروازے اور درچے چ پٹ کھل گئے ہوں۔ جندہاں برساتات برساتا دن برساتا۔ لگاتار برساتا کدن اور رات کا میچ اور شام کا دن اور دن کا فرق نہ تھا چلا گیا اور زمین ٹھہروں سے یوں اوجھل ہوئی جیسے کبھی جی نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ گوے کو کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے تھکی ہوئی۔ اس نے پر پلڑا بھرائے اور کا کھین کا کھین کر تباہ کر دیا۔ مگر بھکارتے کے بعد واپس آ کھینا اور اس کی دانہ کی اطمینان تھی کہ اب کھین کھین کھین نہیں ہے کہ پھٹا لگائے جائیں۔

ہوئے تھے۔ بعد کشتی بیل بولی کہ اسے مرے والی۔ ہمارا گرم خمدور غلط ہو گیا ہے اور پانی کی تھم سے ابل رہا ہے حضرت نے تامل کیا۔ پھر یوں بولے کہ یہ خمدور بڑا دلچسپ کا دن آن پہنچا ہے تو یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس پر وہ جورو یہ بولی کہ میں خمدور پر طشت ڈھکے دو جی ہوں۔ پھر پانی ٹھس اٹھ گیا۔ یہ کہہ کر وہ دوڑی ہوئی اندر گئی۔ طشت اٹا کر خمدور پر ڈھکا اور اور اس کے بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ یہ کر کے وہ باہر آئی اور اپنے والی سے بولی کہ دیکھ میری ترکیب کام آئی۔ پانی اٹھنا بند ہو گیا ہے وہ یہ کہتی تھی کہ پانی کتنا کٹی سے نکل کے باہر امنڈنے لگا۔ طشت اور پتھر اس کے بیچ تیر رہے تھے اور اسی ساعت برابر کے گھر والے کی زوجہ عواس باغت آئی اور چلائی کہ میرے گھر کے خمدور سے فوراً چھوٹ رہا ہے کہ کتنا کٹی میری بل جمل ہوئی۔ پھر مختلف گھروں سے یہاں ٹھہریں حال اس سے کہوش ان کے اڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کلب پہنچ رہی تھی کہ خمدور ان کے گھر کا گرم سے غلط ہوا اور پانی اس سے اٹھنے لگا اور سیلاب باہر سے امنڈنے سے خمدور سے روکا جاسکتا ہے۔ مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے تو کیونکر اس پر بند باندھا جائے۔

سو یوں ہوا کہ دم کے دم میں اس ہستی کے سب خمدور غلط ہو گئے اور وہ ایسا وقت تھا جب ابھی ابھی گھروالوں نے اپنے اپنے خمدور گرم کئے تھے۔ ہر خمدور میں لگا کر دے دیکر رہے تھے۔ اور روئیاں پک کر گرم گرم رقی جس کے دھنک ایک خمدور غلط ہوا۔ پھر دوسرا خمدور غلط ہوا۔ پھر تیسرے خمدور میں آگ بجھی اور پانی پیدا ہوئی۔ پھر چارہ لگا پانی رہنے لگا۔ پھر چھٹے خمدور میں گئی ہو۔ ایک دم سے پانی اٹھنے لگا۔ پانی خمدوروں سے اٹھا کتنا کٹی میں امنڈا اور شاہراہوں میں پھیلا اور پھر بارش شروع ہوگئی ایسے جیسے آسمانوں کے سب درچے کھل گئے ہوں۔ جب حضرت نوح نے کہا کہ بے تک خداوند کے قبر کا دن آن پہنچا ہے اور جب حضرت نوح نے کشتی لٹائی سب جانوروں کے جھڑوں کو اس میں بٹھایا اور زوجہ سے کہا کہ اسے مری زوجہ کی کھجور کی ساعت آن پہنچی خمدور پر ڈھکا ہوا میرا طشت چنے کی مثال میں بی رہ گیا اور آگن تیر پانی سے بھر گیا۔ اب یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔

تس پر وہ زوجہ یہ بولی کہ اسے مرے والی اس گھر میں میں نے تیرے تنگ پانچ سے اوپر برس پہنچنے دن گزارنے نامیں بسر کیں یا ذکر کم دونوں نے فل کر اس گھر میں کتے دکھ دیکھے اور کتے کچھ کھاتے تھے ہار میں بار بار وہ ہوئی دوڑوں نہائی پھوٹوں پڑوٹوں کی بھاری دیکھیں۔ سوئی کہ میں کیونکر اس گھر کو چھوڑ دوں۔"

جب نوح نے فرمایا کہ اسے مری رفیقہ خانہ ہستی ہے بنایا ہے اور مگر کرا دم کے جنوں نے بتائے ہوئے ہیں اور دے خرابی میری کہ میں نے مگر بتایا کچھ ان لوگوں کے جن کے ظلم سے زمین بھر گئی اور بیڑی ہو گئی۔ سو اوصاف اس گھر کا حقد و ظمیر۔ سو اس سے پہلے

اور انکی بلا دے۔

”غیر ذرا۔ کون سے گھر باہر جھانک کے دیکھو۔ کوئی بھی کوئی دیکھارود نہیں دکھائی پڑے ہیں۔ کیا تم نے کھانا کھا کر نہیں سنا کہ انہاں ختم نے گھر اُحا کر کشتی چائی تھی۔“

”اتنا مطمئن نے اچھا نہیں کیا۔“

”ہاں مگر اسی ختم کے خداوند کی تو قیامت کی کتاب زمین پر پانی کے شور کے سوا کوئی خود نہیں ہے کہ اس کی خیمہ میں قتل والے۔“

مارکٹ سے باہر جھانک کے دیکھا۔ چاروں اور گھوڑا، اندھیرا۔ اندھیرا اور ستا اور بھل کی گرجتی دھار پر ہم آقا خیمہ میں تھی اور

اصحت ناگ کے پھینکے ہوئے تھے اس نے سر اندر کر لیا۔ تاریکی تاریکی۔ گہرا لڑکے اور پر اندھیرا تھا اور خداوند کی روح پانیوں پر

جنش کرتی تھی۔ پانی جس کا کوئی اور چھوڑ نہیں تھا۔ پانی کی گرجتی دھار میں ازل اور ابد کے ڈھلے مل جاتے ہیں اور زمین اور زمان

کھل جاتے ہیں انہیں بھونچا نہیں تھا کہ کب سے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور کب سے پر شور پانیوں میں بہہ رہے ہیں انہوں کی

طرح اور کو بھر بھیل ہوا۔ پر بھرا بھرا۔ کو اڑ گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ انہوں نے باہر جھانک کے دیکھا۔ جیسے ایک حکم کیا تھا۔

مگر پانی اسی طرح اڑنے اڑا تھا اور گرج رہا تھا۔ کو سے کا دور دور پر نہیں تھا۔

”کو سیانا جانور ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گا۔“

”خیر یہ تو چھوٹی ہی کیا کر کہیں نہ کہیں فضلی ہے یہ ساری بخشی بخشی بھی کسی نہ کسی کنارے ہاں لگے گی۔ اسے اسے ہمارے وہ ہمیں بہت کئی کی جگہ ہمارے اور حقیقی تو سب سے بڑا ہمارے والا ہے۔“

”مصلحت و برکت کی جگہ کہاں ہے ہم گھر سے پانیوں کے چلنے میں ہیں اور کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ غلٹی کہاں ہے اور برکت کی جگہ کونسی ہے یا اگر نوح ہمارے چلنے میں ہوتا ہے.....“

”نوح؟..... نوح یہاں نہیں ہے۔“

۴۰

سب نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے نوح کہاں ہے۔ جب حاتم خانی نے زبان کھلی اور یہ حکم لب پر لایا کہ ”اے مسلمان عزیزان! عزیزان! تاجر! مہاجر! کسان! ہاتھ سے مست چھوڑ دو۔ دیکھتے رہو کہ یہ کیا نمودار ہوتا ہے۔ مجھے دیکھو کہ میں نے ہماری غلوں کے بچے کتنی کشیدیں میں ستر کیا ہے۔ جن کا کوئی ٹکڑا بھی تھا۔ کان دھر کر سنو کہ خدا کی بیم میں مجھ کی کیا جاتی۔ جہنم دوسرے گرداں چلا جاتا تھا کہ ایک یہ بلند عظیم الشان منظر

پھر چاہوں کہ جوڑے کو پہنکی ہوئی۔ انہوں نے ہری نشئی کا کپڑا کا کپڑا کوئی ملے اور وہ اس میں سبک جا گیا۔ یہ انہوں نے نشئی میں کوئی ملٹ نہ پٹایا۔ عمر مل تو ہوتا چاہے کہ وہ اس میں سبک سکیں یہ سوچ انہوں نے نشئی کے چہنچے کو کٹر با شروع کر دیا۔ نشئی کے جانوروں نے یہ دیکھا۔ اور ہراساں ہوئے یہ سوچ کر کہ مہاراشٹری میں چھید ہو جائے اور اس میں پانی بھر جائے اور وہ فرق ہو جائیگا۔ جب انہوں نے فریادی کہ حضرت نوح سے اور انہوں کا حضرت نوح نے کہ وہ اے فریادی میری کہ میں نے نشئی میں سوار کیا چاہوں کہ جن کا شیوہ ہی یہ ہے کہ کٹر اور سوارا کر۔ حضرت نے انہیں اس محل سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر وہ باز نہ آئے۔ جب حضرت نے گھب آ کر شیر کے منہ پر ہاتھ پھیرا کہ ہاتھ پھیرتے ہی نگلی اس کے نغصوں سے ایک بلی کے کچھنی چاہوں پر اور چٹ کر گئی انہیں دم کے دم میں۔

حبِ شفیق کے سب جانوروں نے شادمانی کی اور بلی پر آفریں بھی کر اس نے انہیں آنے والی تھاپی سے بچالیا۔ چاروں بھوکہ اسی ساعت کھرتی نے پر پلڑا بھڑانے اور شفیق سے باہر نکل آگئی اور دیکھا انہوں نے کہ یہ حتم کیا ہے اور کھورتی زخموں کی پتی چوٹی میں دو بانے واپس آ رہی ہے اور وہ شادمان ہوئے یہ سوچ کر کہ پانی اترنے لگا ہے اور خشکی نمود کرنے لگی ہے مگر پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ رنجی وہ زخموں کی پتی سمیت شفیق میں اتری تو بلی نے اس پر چھٹی اور اسے چٹ کر گئی۔ یہ کیا ہوا انہوں نے دیکھا اور دم خود درہ گئے۔ "ساتھ میں زخموں کی پتی بھی گھب بات ہے۔"

”اب ہم سچے پانیوں میں ہیں اور کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ فطرتی کہاں ہے۔“

جینے بے فکر، غم کیا تھا۔ ہال کی گرین کھٹی دیوار سے سٹائی ٹیبل دی چھٹی، مگر پانی کی دھواہی شور سے گر جی رہی تھی اور اونچے پینڈروں کی چوٹیوں سے گزر رہی تھی۔ کسی کسی نے مڑ کر اٹھ کر باہر دیکھا مگر پھر اندر رہ کر بولی "بہت پانی ہے۔"

اندر جس بہت قہار اور علمی تہمتی تھی۔ باہر پائی گنج راہ قہار زمین و آسمان کے نظر آ رہے تھے۔ زمین و آسمان اور زمین و آسمان کا
 قہار ایک زمانہ ہو گا انہیں گھر گلوں سے نکلے ہوئے اور ایک زمانہ ہو گا انہیں بر سر رہبانوں کے کچے اڈے ہوتے ہوئے۔

”کچھ نہیں، ابھی وہاں نہیں جا سکیں گے۔“

1997

”اپنے گھروں کو“

اپنے گھروں کو؟ ایک بار پھر انہیں حیرانی نے آ لیا۔ گھر! ایک بار پھر گھروں کی یاد نے انہیں ایسے آ لیا جیسے بڑا جھلجھلکاؤں کو آ لے

آیا۔ اسی کی طرف متوجہ ہوا۔ تین دن کے بعد اس کے پیچھے جا پہنچا اور جس چتر کو اٹھا کر دیکھا اس کے سنے لہو بہتے پلایا۔ لکڑ کرنا تھا کہ کوئی یہاں نہیں ہے جس سے اس کا احوال پوچھوں۔ بھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بڑے زور و شور سے بہہ رہا ہے اور اس کا اور چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ نہایت شگفتہ ہوا۔ دل میں کہا کہ یا الہی! اب اس سے کیونکر پڑا تروں۔ اسے میں ایک ناؤ نظر پڑی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے۔ جانا میں نے کہ کوئی ملا لے آتا ہے جب کنارے آگئی تو اس پر کسی کو نہ دیکھا۔ متحجب ہوا۔ بھر شکر خدا کا تھا لا کر سوار ہو لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دسترخوان میں کچھ لپٹا ہوا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی غوراً چاہہ بڑھا کر کھولا تو دو گرم گرم جان اور کباب۔ حیران ہوا کہ یا الہی یہ گرم کس نام سے آئے ہیں۔ دھیان آ گیا کہ شاید ملا نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ پرانے کافن کھانا خوب نہیں اسنے میں ایک چھلکی نے دریا سے سر نکال کر کہا کہ اسے عالم یہ روٹیاں اور کباب حیرانی رزق ہے۔ شوق سے کھا۔ کچھ اندیشہ میں نہ لا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار کھوئی۔ میں حیران کہ کشتی کون لایا کباب روٹی کون دھر گیا چھلکی کون تھی؟

”چھلکی؟“ سب چونک پڑے۔ چھلکی تو ان کے دھیان سے اتنی گئی تھی۔

چھلکی کون تھی۔ ہاں پہلے تو منومی بھونیک رہ گئے تھے۔ پھر ای کی سوچھ کے بال سے انہوں نے ہڈ کو بانہ صا۔

سب نے باہر جھانک کے دیکھا۔ باہر چاروں اور گھوڑا اندھیرا اور اندھ صیارا اور گرہنے ہل کی دھارا۔ ناؤ بھوسا گر امتضا تھا۔ پر چھلکی کا کہیں اتنا پتا نہیں تھا۔

”چھلکی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔“

”متر و استراحت و دہی کے پال سے تو ہم بندھے ہوئے ہیں۔“

سب نے باہر دوڑ نکدیا۔ بس لہرائی رہی دکھائی پڑی۔ چھلکی کہیں نہیں تھی۔ ”متر و رہی تو ہے کہ ساپ زمانہ ڈاکے چاروں اور

لہرائی ہے۔ پر چھلکی نہیں ہے۔“

”یہ تو بہت پتہ کی بات ہے۔“

سوچتا نے انہیں گھبراہٹ اور سہ پہ نے آن بکڑا۔ دور دور کی بات دھیان میں آئی پر سمجھی نہ سکی۔ ڈاؤڈل رہی تھی۔ اور چاروں اور

ہل کی دھارا گرہ رہی تھی۔

